اُردو زبان اور بنیادی لسانیات

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

اُردو زبان اور بنیادی لسانیات

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

اُردو زبان اور بنیادی لسانیات

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جملہ حقوق محفوظ ©

اشاعت : 2015

کتاب : اردو زبان اور بنیادی لسانیات

مصنفہ : ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ناشر : محمد عابد

تزئین : خرم شہباز

قیمت : 300 روپے

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

Urdu Zaban Or Buniyadi Lisaniyat

by

Dr. Rabia Sarfraz

Edition - 2015

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد

Phone: 041-2615359, 2643841, Cell:0300-6668284

E-mail: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، نشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

دادی امّی کے نام

فہرست

پیش لفظ

گزشتہ چند برسوں میں پاکستانی جامعات میں اُردو کے نصاب کے حوالے سے بعض فرسودہ طریقوں سے اجتناب اور گریز کی ایک روش کا آغاز ہُوا ہے۔ جس کے تحت ترجمہ کے فن اور اہمیت کے ساتھ ساتھ زبان اور لسانیات کے حوالے سے بھی مختلف کورسز ڈیزائن کیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے زبان کی ابتدا کے حوالے سے چند مخصوص نظریات کے مطالعے اور ان پر تنقید ہی کو زبان اور لسانیات کا حاصل تصور کیا جاتا تھا۔ تازہ مطالعات کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں زبان کے حوالے سے سائنسی تصورات اور لسانیات کے بعض بنیادی موضوعات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

زبان ایک ایسا نظام ہے جس کے تمام اجزا مخصوص ضابطوں اور اصولوں کے تحت ترتیب پاتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم دیگر افراد تک اپنے خیالات کی ترسیل کرتے ہیں اور اسی کے وسیلے سے اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ کی صورت میں محفوظ کرنے کے قابل ہوتے ہیں جبکہ لسانیات زبان کی حقیقت اور ماہیت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے دائرۂ کار کا جائزہ لیتی ہے۔ مجھے لسانیات کے پرچے کی تدریس کا فریضہ سونپا گیا تو مواد کے حصول کے سلسلے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

زبان اور لسانیات کے ماہرین کی تصنیف اور تالیف کردہ اُردو کتب میں ملنے والا مواد نہایت تکنیکی اور غیر ضروری جزئیات سے بھر پور نظر آیا جو لسانیاتی ماہرین کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن ان طالب علموں کی ذہنی استعداد کے مطابق ہرگز نہیں جو اس مضمون کو پہلی مرتبہ پڑھ رہے ہوں۔ اس حوالے سے ملنے والے مضامین کی کثرت مغربی تحریروں سے ماخوذ اور ترجمہ شدہ ہے اور اُردو کے عام قارئین کی علمی ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہے۔

مَیں نے زبان کے مطالعہ کا ارادہ کیا تو جزئیات کی بھول بھلیوں میں کھو جانے کا خدشہ ہوا۔ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا لسانیات کے حوالے سے بھی ہوا۔ بھاری بھر کم الفاظ اور مغربی اصطلاحات کی بھر مار نے بنیادی موضوعات کی تفہیم کو ادَق بنا ڈالا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کے ماہرینِ لسانیات نے زبان اور لسانیات کے حوالے سے بہت سی کتب تصنیف اور تالیف کی ہیں لیکن جب بھی وہ تمام کتب دیکھیں، بنیادی موضوعات کی تفہیم ایک سنجیدہ مسئلے کی صورت میں سامنے آ کھڑی ہوئی۔ مَیں نے زبان اور لسانیات کے بنیادی موضوعات کی ایک فہرست تیار کرتے ہوئے انھیں آسان زبان میں بیان کرنے کا ارادہ کیا تاکہ یہ تمام مباحث ان طالب علموں کے لیے بوجھل پن کا احساس پیدا نہ کریں جو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے اسے پڑھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات سے دلچسپی قائم کرنا ہر ایک طالب علم کے بس کی بات نہیں لیکن پھر بھی ان کے لیے کچھ بنیادی نکات کی تفہیم از حد ضروری ہے۔

پیشِ نظر کتاب کا مقصد علمیت کے بے جا اظہار سے گریز اور اُردو زبان اور لسانیات کے حوالے سے منتخب کردہ موضوعات کو دلچسپی اور سادگی کے ساتھ نوجوان

نسل تک منتقل کرنا ہے۔ میں نے موضوعات کی مناسبت سے دستیاب شدہ تمام کتب کا مطالعہ کرنے کی حتی المقدور سعی کی ہے اور اُن تمام کتب کے حوالے درج کیے ہیں جن کی مدد سے میری متعلقہ مباحث تک رسائی ممکن ہو پائی۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ مختلف موضوعات کو آسان اور دلچسپ انداز میں نئی نسل تک منتقل کرتے ہوئے اس کی اُردو زبان و ادب سے ذہنی وجذباتی وابستگی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس حوالے سے کانفرنسوں اور سیمینار کے انعقاد کے ساتھ ساتھ ایسی کتب کی تخلیق، ترتیب اور تالیف بھی از حد ضروری ہے جو نوجوانوں کے ذہنوں میں اُبھرنے والے سوالات کے جواب دیتے ہوئے ہر ممکن حد تک ان کی رہنمائی کر سکیں۔ اپنے عالمانہ رویوں میں لچک پیدا کر کے ہی ہم اُردو سے اپنی محبت کا عملی اظہار کر سکتے ہیں نیز ہمارا یہ طرزِ عمل زبان و ادب کے حوالے سے سائنسی مطالعات کے فروغ کے سلسلے میں بھی ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

میں اُمید کرتی ہوں کہ یہ کتاب اُردو زبان اور لسانیات کے حوالے سے سنجیدہ قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہوگی اور زبان و ادب کے ان نام نہاد علم برداروں کو اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور کرے گی جو تبلیغی اندازِ تدریس کو زندگی کا حاصل تصور کرتے ہیں نیز اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے آسان موضوعات کو مزید مشکل بنا کر تحریری صورت میں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

شعبۂ اُردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

نئی نسل کی نمائندہ اُستاد ــــ ڈاکٹر رابعہ سرفراز

زبان وادب کی ترقیات کے لیے ضروری ہے کہ ہمہ جہت مطالعے کو فروغ دیا جائے۔ زبان مستقل تغیر پذیری کے عمل سے گزرتی رہتی ہے اور بیشتر تبدیلیاں اس طرح دبے پاؤں آتی ہیں کہ بسا اوقات ان کا اندازہ بھی نہیں ہوتا لیکن کچھ ہی عرصے میں جب نئے الفاظ، نئے تلفظات ہماری سماعتوں کو چونکانے لگتے ہیں تب کہیں معلوم ہوتا ہے کہ زبان میں ایک اور نئی تبدیلی راہ پا گئی ہے۔ زبان کا معاملہ یہ ہے کہ جس قدر اس کا استعمال عام ہوتا ہے اسی قدر اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ آج کی گلوبل دنیا میں زبانوں کے استعمال کی نوعیتیں بھی تبدیل ہورہی ہیں اور کثرت سے نہ صرف استعمال ہورہی ہیں بلکہ زبانوں میں لین دین کا عمل بھی بڑی تیزی سے ہورہا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دو برسوں میں ہی ہماری زبان میں کئی نئے الفاظ داخل ہو جاتے ہیں۔ کسی زبان کے زندہ و تابندہ ہونے کا یہ ایک بیّن ثبوت ہے لیکن علمی اور ادبی سطح پر اس طرح کی تبدیلیوں پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے تا کہ زبان کے معیارات میں اضافہ ہو سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ علم لسان کے درس و تدریس پر زور دیا جائے۔

اُردو میں لسانیات ایک اہم موضوع ضرور رہا ہے اور اس حوالے سے وقیع

کام ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں حالانکہ اس موضوع پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا دیا جانا چاہیے تھا۔ عہدِ حاضر میں یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں میں لسانیات پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے لیکن اُردو میں اس کا چلن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اُردو کے کئی شعبے ایسے ہیں جہاں لسانیات ایک علیحدہ اسٹریم کے طور پر پڑھائی جاتی تھی مگر اب وہاں اساتذہ نہیں رہے تو کہیں شعبے بند ہو گئے تو کہیں اس اسٹریم کو ہی ختم کر دیا گیا۔ اس کی وجہ لسانیات کے تئیں ہماری بے توجہی ہے۔ تیزی سے بدلتی اس دنیا میں زندگی کی تمام ضرورتوں اور مطالبات نے جس طرح نئی معاشرتی جہات کی بساط بچھائی ہے اسی کے زیرِ اثر زبان نے لفظ و معنی کی سطح پر متنوع تبدیلیوں کو جگہ دی ہے۔ اس پس منظر میں ضروری ہے کہ لسانیات کے مطالعے کو عام کیا جائے تا کہ نئی تبدیلیوں کو صحیح سمت دی جا سکے۔

ڈاکٹر رابعہ سرفراز نئی نسل کے ان نمائندہ اساتذہ میں سے ایک ہیں جو بیک وقت کئی جہتوں سے تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ شاعری، اقبال شناسی، ترجمہ، تنقید و تحقیق اور اب لسانیات کی یہ نئی تالیف قارئین کے سامنے ہے۔ اللہ نے انھیں ذہانت اور متانت کے ساتھ الفاظ کے موزوں اور بھرپور استعمال کے ہنر سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور دیگر ان تمام ممالک کے سنجیدہ قارئین (جہاں اُردو لکھی، پڑھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے) کے لیے رابعہ صاحبہ کی کتب اور مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ رابعہ صاحبہ کی تخلیق، تحقیق اور تنقید کی پختگی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد بلکہ بحیثیتِ مجموعی اُردو زبان و ادب کا معتبر نام ہیں جو روایت کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے بدلتے تقاضوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ادب کی

کسی ایک صنف تک محدود نہیں کر رکھا ہے بلکہ فکر وفن کی تازگی کو اپنا شعار بنایا ہے۔

ڈاکٹر رابعہ سرفراز کی علمی و ادبی دیانت، اخلاص اور ستائش کی تمنا کے بغیر زبان وادب کے میدان میں آگے بڑھتے چلے جانے کی جستجو نے انھیں اپنے ہم عصر اہلِ قلم میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کا مثبت نقطۂ نظر ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ وہ مصائب اور رکاوٹوں کی پروا کیے بغیر اپنے متعین کردہ راستے پر ثابت قدمی سے گامزن ہیں اور یہی استقامت ان کے کامیاب تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی سفر کی دلیل ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی شناخت ان کے اساتذہ کی وہ علمی وادبی کاوشیں ہوتی ہیں جو تخلیق، تحقیق اور تنقید کی صورت میں منظرِ عام پر آتی ہیں۔ اس اعتبار سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد حقیقی معنوں میں مبارک باد کی مستحق ہے جسے رابعہ صاحبہ جیسی سنجیدہ فکر استاد کی خدمات سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔

بطورِ خاص ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے شاملِ کتاب مضمون حروفِ ابجد کی ترتیب و معنویت، میں نہ صرف حروف ابجد کی تاریخ بیان کی ہے بلکہ اس حوالے سے اکابرینِ تحقیق کی طرف سے مسلط کردہ ابلہ فریبیت Mystification کے دبیز پردوں میں چھپے اصل حقائق کا بھی انکشاف کیا ہے۔ ترسیمیات اور رسم الخط اور اُردو زبان کا نظامِ اعراب ایسے وسیع و عمیق موضوعات کو ڈاکٹر صاحبہ نے جس خوبصورتی سے سمیٹا ہے ان کی محققانہ دیدہ ریزی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اُردو زبان اور بنیادی لسانیات، میں شامل تمام مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ کئی مضامین ایسے ہیں جو دعوتِ تحقیق دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ قارئین رابعہ صاحبہ کی رائے سے سو فی صد اتفاق کریں لیکن اُردو زبان کے ارتقا، نئی لفظیات، اُردو کا سنسکرت سے رشتہ جیسے مباحث مستقبل میں تحقیق و تنقید کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

میں ڈاکٹر رابعہ سرفراز کو ''اُردو زبان اور بنیادی لسانیات'' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
پروفیسر سنٹر آف انڈین لینگویجز
سکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر سٹڈیز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

زبان کے تمہیدی مباحث

زبان انسان کی سماجی زندگی کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر سماجی رشتوں کے استحکام کا تصور ہی ناممکن کی ہے۔ تعلیم و تربیت کے تمام وسیلے اسی کی بدولت وجود میں آتے بولی جانے والی مختلف زبانوں کے روپ اور مظاہر میں ایسی رنگارنگی اور تنوع ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تمام مخلوقات سے انسان کو ممیز کرنے والی اسی خصوصیت کے باعث انسان کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں بعض مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں جنھیں زبان سے متعلق مباحث میں پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ زبان کو اظہار کا ایسا وسیلہ قرار دیا گیا ہے جو متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے زبان کی آلاتی اور صوتی و لطقی حیثیتوں کو اہمیت دی ہے۔ نورالحسن نیر کاکوروی نے زبان کو ایسی بولی قرار دیا ہے جس کے ذریعے انسان دل کی بات کر سکتا ہے یعنی انھوں نے بھی زبان کو لطقی وسیلہ اظہار و ابلاغ قرار دیا ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے زبان کو تخیل اور خیال کے اظہار اور ادائے مطلب کا ذریعہ کہا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے زبان کو خیالات کا ذریعہ کہا ہے جس کا کام لفظوں اور فقروں کے وسیلے سے انسانی ذہن کے مفہوم اور عام خیالات کی ترجمانی

ہے اور اس ترجمانی کے لیے قوتِ گویائی کو مکمل اور واضح ذریعہ قرار دیا ہے۔ اُردو لغت میں زبان کی درج ذیل تعریف درج ہے:

''زبان منہ کے اندر کا وہ عضو جس میں قوتِ ذائقہ ہوتی ہے اور جو نطق کا ذریعہ ہے۔

جیبھ

بولی: جس کے ذریعے انسان تکلم یا تحریر کی صورت میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

بول چال۔ روزمرہ۔ بات۔ قول۔''(۱)

فرہنگِ تلفظ میں زبان کی درج ذیل تعریف کی گئی ہے:

''زبان۔ منہ کے اندر ذائقہ چکھنے اور بولنے میں حرکت کرنے والا عضو''(۲)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی رائے میں:

''زبان خیالات کا مجموعہ ہے اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ اس ترجمانی میں وہ حرکاتِ جسمانی بھی شامل ہیں جو کسی مفہوم کے سمجھانے کے لیے خاص خاص زبان بولنے والوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں۔۔۔ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔''(۳)

زبان اظہار کا ایک ایسا وسیلہ ہے جو بامعنی تراکیب میں ظاہر ہونے والی تکلمی

آوازوں کے ذریعے ابلاغ کا فریضہ انجام دیتا ہے۔غور وفکر اور ذہنی رابطوں کے سلسلے میں زبان ایک اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔زبان مخصوص قاعدوں اور ضابطوں کا ایسا سیٹ ہے جو صوتی یا فونیمیاتی، گرامر اور معنویاتی نظام سے ترکیب پاتا ہے۔زبان کے دو مقاصد ہیں جنھیں بنیادی اور ثانوی مقاصد کہا جاتا ہے۔ابلاغ اور تبادلۂ خیالات زبان کے بنیادی مقاصد ہیں جبکہ دیگر ذہنی اعمال مثلاً فکر اور خود آگہی وغیرہ کا شمار ثانوی مقاصد میں کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر سہیل بخاری کے بقول:

> ''زبان انسانی آوازوں کا وہ با معنی نظام ہے جس کے ذریعے افراد جماعت میں رابطہ استوار ہوتا ہے۔انسان اپنے ساتھیوں کو متاثر کرنے کے لیے بولتا ہے اور زبان کے وسیلے سے ان کی امداد طلب کرتا ہے تاکہ سب کے ساتھ مل جل کر اپنے ماحول پر قابو پا سکے۔''(۴)

فکر کو خاموش گویائی سے تشبیہ دی جاتی ہے یعنی ہم سوچنے کے عمل کے دوران میں آہستہ آہستہ بولتے ہیں جبکہ بولنے کے عمل کے دوران میں بلند آواز میں سوچتے ہیں۔یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انسان غور وفکر کے عمل کے دوران میں اندرونی طور پر بولتا ہے اور اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہے جبکہ گفتگو کے عمل کے دوران میں بھی سوچنے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔اگر ایسا نہ ہو تو ہماری تمام گفتگو بے معنی ہو جائے۔زبان کے بغیر فکر کا ارتقائی سفر ناممکن ہے۔زبان کی مدد سے لاشعور میں پوشیدہ افکار و تجربات اور حقائق کی بازیافت میں بھی آسانی ہوتی ہے۔پرانے تجربات و احساسات کو الفاظ کے ذریعے ہی معنی عطا کیے جاتے ہیں اسی طرح نئے احساسات کو مفہوم دینے اور نئے اور پرانے احساسات و جذبات کی آمیزش کے سلسلے میں بھی زبان کو مرکزی اہمیت حاصل ہے یعنی زبان ابلاغ کے ساتھ ساتھ جذبات

کے اظہار کا بھی اہم وسیلہ ہے۔زبان کا نظام چار مظاہر پر مشتمل ہوتا ہے جن میں حروفِ ابجد، علمِ صرف، علمِ نحو اور زبان میں استعمال کیے جانے والے کلمے اور ان کے معانی کی فہرستیں شامل ہیں جو لغت اور فرہنگ کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ابلاغ کے عمل میں تکلمی آوازوں کو خاص اہمیت حاصل ہے تکلمی آوازوں کا وسیلہ سمعی میڈیم کہلاتا ہے۔اظہار وابلاغ کا دوسرا اہم ذریعہ تحریر ہے جس کا اہم وسیلہ قوتِ باصرہ ہے اسی حوالے سے تحریر بصری میڈیم کہلاتی ہے۔بقول خلیل صدیقی:

> ''تکلمی آوازوں کی ترکیبیں اور ڈھانچے معنویت پا کر مجموعی طور پر زبان کہلاتے ہیں۔گویا زبان تکلمی آوازوں کی مخصوص ترکیبوں اور ڈھانچوں میں مضمر ہوتی ہے جنھیں تکلمی آوازیں تشکیل دیتی ہیں۔ لہٰذا زبان کو میڈیم سے متمیز کیا جانا چاہیے۔ تکلمی آوازیں یا میڈیم ہی وہ مواد ہے جس سے زبان کی ہیئت تشکیل پاتی ہے۔''(۵)

زیادہ شرح خواندگی والے معاشروں میں پڑھنے لکھنے کی استعداد کی وجہ سے زبان کو تحریری نظام بھی تصور کرلیا جاتا ہے جبکہ زبان تکلمی ابلاغ کا ایسا نظام ہے جس کی نمائندگی کی ایک صورت تحریری بھی ہوسکتی ہے۔زبانیں بول چال کی بدولت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہیں۔زبان میں ابلاغی خصوصیت نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔اسی کے باعث کلام بامعنی تصور ہوتا ہے۔جملے کو زبان کی اکائی کہا جاتا ہے اور ہر جملہ بامعنی کلام پر مشتمل ہوتا ہے۔اسی کی بدولت زبان کی غرض وغایت پوری ہوتی ہے۔جب بچہ زبان سیکھتا ہے تو وہ ایک جملے کو بار بار دہراتا ہے۔دہرائی کا یہ عمل اس کی صوتی سہولت اور استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔

پہلے وہ خارجی حوالے سے آسان اشیا کے نام سیکھتا اور دہراتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ مختلف انداز سے الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ترتیب سیکھتا ہے۔ یہی اس کا زبان سیکھنے کا ابتدائی عمل ہے۔ وہ غلطیاں کرتا ہے اور بڑے اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ اس طرح اسے جملے بنانے آتے ہیں' اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہتا ہے۔ زبان کی مختلف صورتوں میں روزمرہ' محاورات اور کہاوتوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ محاورات اور کہاوتوں میں تصرّف نہیں کیا جاتا جبکہ ہر بولی کا اپنا روزمرہ ہوتا ہے جو لسانی عادات کا ترجمان ہوتا ہے۔ زبان میں ایک ہی معنی کے لیے ایک سے زیادہ کلمے بھی استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں مرادفات کہا جاتا ہے لیکن کسی بھی زبان میں ایسے کلموں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ اُردو میں عربی اور فارسی کے اثرات کے باعث مرادفات کی خاصی تعداد موجود ہے لیکن بغور جائزے کے بعد ان کے مفاہیم میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور نظر آتا ہے۔

زبان سیکھنے کا عمل ماں کی گود سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں کسی دوسرے علاقے، شہر یا ملک سے کوئی بچہ گود لے لیا جاتا ہے ایسی صورت میں وہ ابتدائی طور پر وہی زبان سیکھے گا جو اُس ماحول میں بولی جارہی ہو۔ اسی مناسبت سے لسانیات میں اسے پہلی زبان کہا جائے گا۔ لسانیات میں مادری زبان کی اصطلاح اس لیے بھی استعمال نہیں کی جاتی کہ بہت سی صورتوں میں جب بچہ اپنی ماں کی گود کی بجائے کسی اور جگہ پرورش پاتا ہے تو اس کی سیکھی جانے والی ابتدائی زبان مادری نہیں ہوسکتی۔ پہلی زبان سیکھنا سب سے آسان ہے کیونکہ اس عمل کے دوران میں اعضائے نطق کو کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جبکہ اس ابتدائی زبان کے بعد فرد زندگی کے کسی بھی مرحلے میں جب بھی کوئی اور زبان سیکھے گا تو پہلے سے سیکھی ہوئی

زبان کے اثرات کسی نہ کسی صورت اس پر ضرور مرتب ہوں گے اور بعد میں سیکھی جانے والی زبان بعض صورتوں میں اپنے معیارات سے انحراف بھی کر سکتی ہے۔

بعض اوقات سماجی، معاشی اور معاشرتی ضروریات اور تقاضوں کے پیشِ نظر انسان کو ایک سے زیادہ زبانیں سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی زبانیں جنھیں وہ ان ضروریات کے باعث سیکھتا ہے ثانوی زبانیں کہلاتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ثانوی زبان کے بولنے میں ہر فرد کو کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا پڑے۔ بعض افراد ثانوی زبان پر بھی ابتدائی زبان کی طرح عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ زبان جس میں انسان سوچتا ہے، اُس کی فکری زبان کہلاتی ہے۔ عام طور پر افراد کی اکثریت ان کی ابتدائی زبان میں ہی غور و فکر اور سوچ بچار کرتی ہے لیکن اگر کوئی فرد ثانوی زبان پر عبور اور مہارت حاصل کر لے تو وہ ثانوی زبان میں بھی سوچ بچار کے اس عمل کو جاری رکھ سکتا ہے۔ سوچ بچار، غور و فکر اور عام بول چال کی زبانیں زندہ زبانیں کہلاتی ہیں۔ ایسی زبانیں جو محض خواص تک محدود ہو جائیں یا انھیں صرف علمی و ادبی مشاغل کے لیے برتا جائے اور ان زبانوں تک عوام کی رسائی نہ ہو، وہ آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب انھیں بولنے اور سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں انھیں مردہ قرار دے دیا جاتا ہے۔

کوئی بھی زبان اسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اسے بولنے، سمجھنے، سننے اور یاد رکھنے والے افراد موجود ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ علم و ادب اور فکر و آگہی کے تمام تقاضے بھی احسن طریقے سے پورے کرتی ہے لیکن اگر وہ بول چال کی زبان نہ رہے تو محض کتابیں ان زبانوں کو زندہ نہیں رکھ سکتیں۔ ماضی میں بولی جانے والی بے شمار زبانیں آج مردہ قرار دی جا چکی ہیں کیوں کہ انھیں بولنے اور سمجھنے والا کوئی

نہیں۔ ایسی زبانیں محض یادگاروں، لوحوں اور کتبوں پر علامتوں کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ بعض زبانیں جو عام بول چال کی زبانیں تھیں ان کے گرد علما نے تقدس کا ایک ایسا حصار کھینچ دیا کہ وہ عوامی رابطے سے کٹ گئیں اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئیں۔ ایسی زبانیں جنھیں پڑھا او سمجھا تو جاسکتا ہو لیکن غور و فکر یا بول چال میں استعمال نہ کیا جاسکتا ہو زندہ زبانیں نہیں کہلاتیں کیونکہ وہ ابلاغ کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ مردہ زبانیں اپنے دور کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں لہٰذا انھیں بعد کے ادوار میں زندہ زبانیں بنانے کی کوشش کرنا بے کار کا مشغلہ ہے۔ جو زبانیں ماضی کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں وہ مستقبل کے بدلتے سماجی تقاضوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔

مرد اور خواتین کے لب ولہجہ اور آواز کی کیفیات میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح ایک جنس سے تعلق رکھنے والے دو افراد کی آواز بھی ہو بہو ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ وتران الصوت (Vocal Chords) اور سُر (Pitch) کا فرق ہے۔ مختلف افراد کی صوتی عادات اور رویوں میں فرق ہوتا ہے جبکہ مختلف صورتوں میں ایک فرد کی صوتی عادات اور رویے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً گھر میں بول چال کا انداز، دوست احباب کے ساتھ گفتگو کا انداز، ملازمت کے اوقات میں اپنے افسران اور ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کا طریقہ۔۔۔ یہ سب مختلف اوقات میں مختلف انداز گفتگو کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان تمام انحرافات کے باوجود یہ کہنا مناسب نہیں کہ ایک فرد مختلف زبانیں بول رہا ہے کیونکہ وہ ایک ہی زبان کو مختلف انداز میں بول چال کا ذریعہ بنا رہا ہے۔

لسانی گروہ کے مختلف طبقوں میں بولیوں کے ذریعے سے ابلاغ کی ضروریات

پوری ہوتی ہیں۔ بولیوں کو غلط یا صحیح قرار دینا مناسب نہیں ہے البتہ ان کی کوئی معیاری صورت ضرور ہو سکتی ہے۔ معیاری بولی کی تعریف و توصیف کی مختلف سماجی وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک ہی علاقے کی ایک بولی میں موجود انحرافات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اس کے برعکس جغرافیائی اور علاقائی بنیادوں پر بولی اور زبان کے انحرافات پر زیادہ توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر برسرِ اقتدار طبقے کی بولی کو فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے اور اسی کو معیار سمجھتے ہوئے درس و تدریس اور دیگر سرکاری معاملات پر لاگو کیا جاتا ہے۔ عوام بھی اپنے آپ کو سماجی اعتبار سے بہتر ثابت کرنے کے لیے اس بولی کی تقلید کرتے ہیں اور تحریر و تقریر اور عام بول چال میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری ''بولی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''بولی معنی دار آوازوں کی وہ ڈوری ہے جو لوگوں کو آپس میں باندھے رکھتی ہے۔ اسے اکیلے پن سے بیر اور دکیلے پن سے پیار ہوتا ہے اور سجا سجانے کو کم سے کم دو آدمی چاہتی ہے۔ ایک بولنے والا دوسرا سننے والا۔ آدمی اکیلا ہو تو اسے بولی سے کوئی کام نہیں ہوتا اور وہ اپنی چپ میں مگن رہتا ہے پر دوسرے کو دیکھتے ہی اسے بولی کی سدھ آجاتی ہے۔''(۶)

بولیوں پر دو متضاد رجحانات اثر انداز ہوتا ہیں جن میں سے ایک سماجی جبکہ دوسرا جدید زندگی کی گہما گہمی اور تعلیمی رجحان ہے۔ پرانے زمانے میں پہلا رجحان زیادہ اہم تھا لیکن عصرِ حاضر میں تعلیم کے فروغ اور تہذیبی ارتقا کے باعث صورتِ حال تبدیل ہو چکی ہے۔ مقامی بولیاں دور افتادہ دیہاتوں تک محدود ہو گئی ہیں اور بعض صورتوں میں ان پر بھی معیاری زبان کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں نسبتاً کم لوگ معیاری زبان بولتے ہیں اس کی ایک وجہ شرح خواندگی میں کمی ہے۔

ایسے لوگ جو ہر مقام اور ہر موقع پر معیاری زبان بولتے ہوں ان کی تعداد کم ہے اور ان میں سے بھی بیشتر کا تعلق شہروں سے ہے۔ جن مقامات پر دیہی آبادی شہری اثرات قبول کر رہی ہے اور حصولِ علم کے رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے، وہاں معیاری زبان کے اثرات بھی بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔ خلیل صدیقی کے بقول:

''معیاری زبان بنیادی طور پر بولی ہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اپنے زمرے کی بولیوں میں سماجی اور سیاسی وجہ سے امتیازی حیثیت مل جائے اور وہ تحریر و تقریر، علم و ادب کی زبان بن جائے۔ لیکن ایسی صورت میں وہ کتابی زیادہ ہو جاتی ہے اور بول چال کی نسبتاً کم۔ اگر یہ نسبت بہت کم رہ جائے تو پھر وہ عوام سے کٹ جاتی ہے اور اس کے زندہ رہ جانے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں لیکن اگر بول چال میں بھی مروج رہے تو پھر ترقی یافتہ حیثیت میں زندہ بھی رہتی ہے۔ ایک زمرے کی بولیاں خواہ انھیں لسانی گروہ میں کوئی بھی حیثیت دی جاتی ہو، ایک ہی نظام کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کے صوتی نظام، گرامر کے نظام، معنویاتی نظام میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا، جو تفاوت بھی ہوتا ہے، جزوی ہوتا ہے۔ اگر ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہیں تو ایک ہی رسم الخط میں۔ ان کی لسانیاتی توضیح اور تجزیے کے مناہج یکساں ہوتے ہیں۔''(۷)

کوئی بھی ماہر لسانیات ایک بولی کو دوسری پر ترجیح نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس کے صحیح یا غلط ہونے کے حوالے سے کوئی فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔ وہ یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتا کہ بولی کو کیسا ہونا چاہیے یا کیسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ بولی 'کیا' ہے۔ ماضی میں عورتوں کی زبان کو مستند تصور کیا جاتا تھا اور

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ عورتوں کا سماجی دائرہ محدود تھا اور اسی وجہ سے ان کی زبان خارجی اثرات سے محفوظ ہونے کے سبب اصل سے قریب تر تھی۔ ایسے قبیلوں کی دریافت بھی کی گئی جہاں مردوں اور عورتوں کی زبان ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی اور عورتیں مردوں کی زبان سمجھ سکتی تھیں مگر بولنے سے قاصر تھیں۔ ترقی یافتہ دور میں بھی عورتوں کے لسانی رویے مردوں سے مختلف ہیں اور یہ فرق لب ولہجہ اور اسالیب میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ تعلیم کے فروغ اور تہذیبی ارتقا کے باعث بولیوں کے باہمی اختلافات میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے لیکن بعض ایسی علمی اصطلاحات اور اسالیب بھی منظرِ عام پر آگئے ہیں جو کسی مخصوص طبقے کے علاوہ باقی تمام پڑھے لکھے افراد کی فہم وفراست سے ماوراہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بعض پڑھے لکھے ادیب عام فہم اور سادہ زبان میں بات کرنا بھول چکے ہیں۔ لسانیاتی جائزوں میں ایسے رویے بھی خاصی توجہ کے متقاضی ہیں جو ہماری زبان کو بول چال کی زندہ اور فطری زبان سے دور کرکے محض کتابی زبان بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہ رویے درحقیقت زبان کے فروغ کی بجائے اسے محدود کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

زبان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف تغیرات بھی عمل میں آتے ہیں مثلاً انیسویں صدی کے آغاز کی اُردو زبان آج کی اُردو سے بہت حد تک مختلف ہے۔ غالب کے استعمال کردہ بہت سے کلمات اب متروکات میں شمار کیے جاتے ہیں مثلاً آوے ہے، اودھر، ایدھر، جیوں، تیوں، واں، یاں وغیرہ۔ اُردو کے تغیرات کے باعث پاکستانی اُردو اور بھارتی اُردو میں واضح تمیز کی جاسکتی ہے۔ زبان میں صوتی تغیرات سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ کلمے میں بالکل کوئی نئی آواز پیدا ہو جائے بلکہ ایک یا ایک سے زیادہ آوازوں کے دوسری آوازوں میں تبدیل ہو جانے کو صوتی تغیرات کا

جس نے زبان کے مباحث، بولیوں اور ادبی اور عامیانہ زبان کا تصور پیش کرتے ہوئے اطالوی زبان کی چودہ بولیوں کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اطالوی اور فرانسیسی کو ایک ہی طرح کی زبانیں قرار دیا۔ سولھویں صدی میں ایک مخصوص رجحان کے پیشِ نظر تمام یورپی زبانوں کو عبرانی کی شاخیں قرار دیا گیا۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں سنسکرت، لاطینی اور یونانی کے باہمی روابط پیش کیے گئے اور یہ بھی کہا گیا کہ قدیم فارسی بھی انھیں زبانوں کی اصل کی پیداوار ہے۔

ڈنمارک کے ماہرِ لسانیات ریسک (R.Rask) نے ۱۸۱۴ء میں دو زبانوں کی گرامر کی مشترک خصوصیات کو ان کے ایک ہی خاندان سے تعلق کی بہترین سند قرار دیا۔ اس کا اہم کارنامہ ہندیورپی اور فنش زبانوں کی گروہ بندی ہے۔ اس نے ہندیورپی زبانوں کو چھ اقسام میں تقسیم کیا۔

(۱) انڈین (ہندوستانی زبانیں)

(۲) ایرانِک (فارسی، آرمینی اور ادستیک زبانیں)

(۳) تھریسئین زبانیں (یونانی، لاطینی)

(۴) سرمائٹین (لیٹک، سلاوی زبانیں)

(۵) گاتھک (جرمانک، اسکنڈی نیوین زبانیں)

(۶) کیلٹک (برطانوی، گیلک زبانیں)

ریسک نے لسانی رشتوں کے صوتی اشارے بھی پیش کیے اور پہلی مرتبہ دراوڑی زبانوں کو سنسکرت سے مختلف قرار دیتے ہوئے ''مالاباری'' کا نام دیا۔

جرمن ماہرِ لسانیات فرانز بوپ نے زبانوں کو تین لسانی درجوں میں تقسیم کیا۔ بقول خلیل صدیقی:

''پہلا زمرہ ان زبانوں کا جو یک رکنی ہیں اور جن میں تالیف، تصریف اور گردان کا عمل نہیں ہوتا۔ کلموں کے محلِ استعمال اور لہجے سے قواعدی رشتوں کا تعین ہوتا ہے مثلاً چینی زبان۔ دوسرا گروہ ان زبانوں کا جو سہ حرفی ہوتی ہیں اور جن کے مادے دو رکنی ہوتے ہیں۔ مصوتوں کی تبدیلیوں سے نئے کلمے بنتے اور قواعدی حق ادا کرتے ہیں۔ اشتقاق اور تصریف کا عمل زیادہ تر اندرونی ہوتا ہے۔ سابقوں اور لاحقوں سے کم مدد لی جاتی ہے مثلاً سامی زبانیں۔ تیسرا گروہ ان زبانوں پر مشتمل ہے جن کے مادے ہوتے تو یک رکنی ہیں لیکن ترکیبی اور تصریفی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تعمیری کلموں یا سابقوں اور لاحقوں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ افعال کی گردان میں ضمائر متصل ہوتے ہیں۔ ہندیورپی زبانیں اور پہلے اور دوسرے گروہ میں شامل نہ کی جانے والی زبانیں، اس گروہ میں شمار کی جانی چاہئیں۔''(۱۰)

گرے نے زبانوں کے چھبیس خاندان بیان کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ہندیورپی	۱۳۲ زبانیں
حامی سامی	۴۲ زبانیں
یورالی	۳۲ زبانیں
التائی	۳۴ زبانیں
جاپانی، کوریائی	۲ زبانیں
اسکیمو	۲۴ زبانیں
کاکیشی	۲۶ زبانیں
آئبیرو	۲ زبانیں
مشرق قریب اور ایشیائی معدوم زبانیں	۲۹ زبانیں

ہائپر بوری اور عتیق ایشیائی	۱۲زبانیں
بروشاسکی	ازبان
دراوڑی	۲۶زبانیں
انڈومانی	۱۲زبانیں
چینی تبتی	۱۱۵زبانیں
لائی	ازبان
آسٹروایشیاٹک	۵۲زبانیں
ملایاپولینیشیائی	۲۶۳زبانیں
پاپوائی	۱۳۲زبانیں
آسٹریلیائی	۹۲زبانیں
تسمانیائی	۵زبانیں
سوڈان گنی	۴۳۵زبانیں
بانتو	۸۳زبانیں
ہائن ٹاٹ، بش مین	۶زبانیں
شمالی امریکہ	۳۵۱زبانیں
میکسیکواوروسطی امریکہ	۹۶زبانیں
جنوبی امریکہ	۸۳۷زبانیں[11]

ہندیورپی زبانوں میں جرمانی، اٹالک، کیلٹک، بالٹوسلاوی، سلاوی زبانیں، ہیلنک یا قدیم یونانی، البانی اور آرمینی اہم ہیں۔

جرمانی کی تین شاخیں ہیں جنھیں شمالی، مشرقی اور مغربی میں تقسیم کیا گیا ہے۔

شمالی شاخ کا ریکارڈ کتبوں کی صورت میں دستیاب ہے اور یہ تیسری اور آٹھویں صدی کے درمیانی عرصے سے تعلق رکھتا ہے اس کی مزید دو ارتقائی شکلیں ہیں ایک کو مغربی

اسکینڈی نیوی جبکہ دوسری کو مشرقی اسکینڈی نیوی کہا جاتا ہے۔ مغربی اسکینڈی نیوی آئس لینڈک اور ناروجین زبانوں پر مشتمل ہے جبکہ مشرقی اسکینڈی نیوی سویڈش اور ڈینش زبانوں پر مشتمل ہے۔ گاتھک کو مشرقی زمرے کی نمائندہ زبان قرار دیا جاتا ہے اس زمرے کی بیشتر زبانیں معدوم ہو چکی ہیں۔ جرمانی کا مغربی حصہ لسانیاتی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس کی دو بڑی اقسام ہائی جرمن اور لو جرمن ہیں۔ ہائی جرمن کی اہم زبان جدید جرمن ہے جو جرمنی، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، فرانس، بلجیم اور ہالینڈ وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ لو جرمن میں اینگلو فریشیئن، ڈچ اور فلیمش زبانیں شامل ہیں۔

اٹالک کی اہم زبان لاطینی ہے۔ کیلٹک کی بولیوں میں برٹن (Briton) ویلش (Welsh) کورنش (Cornish) بریٹون (Breton) اور گیلک (Gaelic) اہم ہیں۔ بالٹک میں قدیم پروشیئن، لتھونی اور لیٹیش شامل ہیں۔ سلاوی زبانوں کو جنوبی، مشرقی اور مغربی سلاوی زبانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جنوبی سلاوی کے قدیم دستاویزی شواہد بائبل کے سلاوی تراجم کی صورت میں ملتے ہیں۔ اس کی مختلف صورتیں یوگوسلاویہ اور بلغاریہ میں بولی جاتی ہیں۔ مشرقی سلاوی کو لٹل رشئین، وائٹ رشئین اور گریٹ رشئین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ زبان یوکرائن، شمالی امریکہ اور وسطی اور مغربی روس میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہیلنک یا قدیم یونانی یورپ کی معروف ترین قدیم زبان ہے جس کے شواہد بارہویں صدی قبل مسیح میں ملتے ہیں۔ یہ بحیرۂ روم کے ممالک میں رائج تھی لیکن اب یونان تک محدود ہے۔ یہ زبان دیگر زبانوں کے لیے علمی سرچشمے کی حیثیت کی حامل ہے۔ البانی کو ہند یورپی خاندان کا سب سے چھوٹا خاندان تصور کیا جاتا ہے۔ البانوی زبان میں ترکی اور وینیشین کلموں کی آمیزش بھی ہے۔ اس کی دو بولیاں

ہیں۔ شمالی کا نام غیگ (Gheg) اور جنوبی کا نام توسک (Tosk) ہے۔ اس کی قدیم ترین یادگاری سترھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے ہندیورپی کی ایک معدوم شاخ قرار دیا جاتا ہے۔ آرمینی کا کیشیا کے جنوب اور ترکی کے مشرق میں بولی جاتی ہے۔ اس میں قدیم فارسی کے الفاظ کی کثرت ہے۔ اس میں فرانسیسی الفاظ کے ساتھ ساتھ روسی اصطلاحات بھی شامل ہو چکی ہیں۔

ہند ایرانی میں ایرانی، فرسِ قدیم، پہلوی، زبانِ سغدی، زبانِ دری، بلوچی، پشتو اور وردی بولیاں شامل ہیں۔ ابتدائی بابلی اور حطی دستاویزوں میں ایک ایسی قوم کی طرف اشارے ہیں جو آریائی زبان بولتی تھی۔ یہ لوگ ایران کے ''ماذ'' کے آباؤ اجداد تھے جو عراق، کردستان اور مغربی ایران میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ ملک الشعرا محمد تقی بہار نے ان کی زبان کو ''زبانِ مادی'' کا نام دیا ہے اور اسے ایران کی قدیم ترین زبان قرار دیا ہے۔ انھوں نے ''اوستا'' کی زبان کو دوسری قدیم زبان قرار دیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ ''اوستا'' اصل میں ''اوپستاک'' ہے جس کے معنی ہیں بنیادِ محکم۔ دری زبان میں کلمے کا اختتامیہ ''ک'' ادائے تلفظ کے دوران حذف ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے ''اوستا'' کہا جاتا ہے۔ ایران کی دوسری قدیم زبان فرسِ قدیم ہے اس کا رسم الخط میخی ہے جو بائیں سے دائیں جانب پڑھا جاتا ہے۔ پہلوی خراسان کے ایک قبیلے کا نام سے موسوم ہے۔ زبانِ سغدی سغد کی زبان ہے جس کا مرکز سمرقند ہے۔ مشرقی ایران کی زبان کو دری کہا جاتا ہے۔ یہ ایران کے بہت سے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ بلوچی زبان ایشیا کے وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پشتو کو ایرانی زمرے کی قدیم زبان قرار دیا جاتا ہے۔ یہ افغانستان، خیبر پختونخواہ کے بیشتر علاقوں اور بلوچستان میں جزوی اختلافات کے ساتھ مروج ہے۔ دردی بولیاں کشمیر، گلگت،

چترال، پامیر کے جنوب اور کوہ ہندوکش کے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

ہند آریائی زبانوں سے مراد وہ زبانیں ہیں جو جنوبی ایشیا اور قدیم ہند میں آریاؤں کی آمد کے بعد اپنی امتیازی حیثیت سے نمایاں ہوئیں اور انھوں نے ارتقائی منازل طے کیں۔ ہند آریائی کی قدیم ترین دستاویز رگ وید کو تسلیم کیا جاتا ہے اور رگ وید سمہتہ کا تخلیقی دور ۱۵۰۰ ق م بیان کیا جاتا ہے۔ بقول خلیل صدیقی:

> ''اس وقت آریا تحریر کے فن سے ناواقف تھے۔ رگ وید بھجنوں اور منتروں کی تخلیق وقتاً فوقتاً ہوتی رہی تھی، مختلف رشی مختلف زمان و مکاں میں یہ تخلیقات کرتے رہے تھے۔ تخلیق کے چھ سات سو سال بعد انھیں ضبط تحریر میں لایا گیا۔''(۱۲)

آریاؤں نے دراوڑی تہذیب اور زبانوں کے باعث دراوڑی مذہبی اعتقادات اور عناصر بھی اپنا لیے تھے۔ اسی طرح دراوڑی بھی آریاؤں سے خاصے قریب ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے ملاپ سے ہند آریائی زبانیں وجود میں آئیں۔ ہند آریائی لسانی تاریخ کے ہر دور میں کوئی ایک زبان لنگوا فرینکا کی حیثیت سے سامنے آتی رہی ہے۔ اس کی وجوہات مذہبی اور سیاسی دونوں ہو سکتی ہیں۔ اے سی وولنر کی رائے میں قدیم آریائی زبان کے ادبی ادوار (۱) رگ وید (۲) دوسرے وید (۳) رزمیہ نظمیں (۴) پر تصنع ادبی سنسکرت پر مشتمل ہیں۔ بھنڈارکر نے قدیم ہند آریائی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ''رگ وید'' سے متعلق ہے۔ دوسرے دور کا تعلق درمیانی سنسکرت سے ہے اور اس میں پانِنی کی گرامر اور ''براہمنہ'' کی تخلیق ہوئی جبکہ تیسرا دور ادبی سنسکرت سے متعلق ہے جس میں مہابھارت اور رامائن جیسی رزمیہ نظمیں تخلیق ہوئیں۔ اس دور میں قدیم شعرا کا کلام اور منظوم سمرتیوں، منسمرتی ''کاتیائین'' اور ''پتن جلی'' کی تفسیریں

دستیاب ہیں۔

مذہبی پراکرتوں میں پالی (وہ زبان جس میں دھرم شاستر بیان کیا گیا ہے) سرفہرست ہے۔ اسے اشوک کے عہد میں شمالی ہند کی لینگوا فرینکا کی حیثیت حاصل تھی۔ اردھہ ماگدھی (سوتامبر جَین مت کے قدیم ''سوتروں'' کی زبان جس میں مہاویر نے اپنے دھرم کی تبلیغ کی) کو دیوتاؤں کی زبان کہا جاتا رہا۔ جین مہاراشٹری میں سوتامبر جینیوں نے غیر مذہبی ادب کی تخلیق کی۔ جین شورسینی، دگمبر جینیوں کی مذہبی زبان ہے جس پر اردھہ ماگدھی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اپ بھرنش وہ زبان ہے جسے دگمبر جینیوں نے مذہبی اور ادبی اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بنایا۔ ادبی پراکرتوں میں مہاراشٹری نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ پیشاچی وہ زبان ہے جسے سنسکرت ڈراموں میں نچلے طبقے کے کرداروں کے مکالموں کی ادائیگی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

اشوک کے دور کے قدیم کتبوں کے فرامین براہمی اور کھروشٹی رسم الخط میں ہیں جبکہ غاروں اور قدیم ستونوں میں پراکرتی کے نمونے ملتے ہیں۔ پراکرتیں نا صرف سنسکرت سے متاثر ہوئی ہیں بلکہ انھوں نے سنسکرت پر اپنے اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانیں صوتی، صرفی اور نحوی اعتبار سے خاصی ملتی جلتی ہیں اور ان میں جزوی اختلافات نظر آتے ہیں۔

گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں کو اندرونی اور بیرونی دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ بیرونی گروہ کو شمال مغربی، جنوبی اور مشرقی شاخ میں تقسیم کیا ہے۔ شمال مغربی شاخ میں لہندا اور سندھی، جنوبی شاخ میں مراٹھی اور مشرقی شاخ میں آسامی، بنگالی، اڑیا اور بہاری زبانیں شامل ہیں۔ اندرونی زبانوں میں مغربی ہندی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی، بھیلی، خاندیشی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ درمیانی زبانیں مشرقی ہندیاور پہاڑی زبانوں کا ذکر بھی شامل ہے۔ گریرسن نے دوگروہی تقسیم کے دوران وضاحت کی ہے کہ بیرونی اور اندرونی زبانوں کے اختلافات قدیم زبانوں سے وراثت میں ملے ہیں۔ محی الدین قادری زور نے بھی زبانوں کی گروہ بندی میں گریرسن کی تقسیم کو بنیاد بنایا ہے لیکن انھوں نے پنجابی کو شمال مغربی گروہ میں شامل کرتے ہوئے اسے مشرقی پنجابی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے ہیں۔ بنگالی پر مشرقی ہندی اور اُردو کے اثرات ملتے ہیں جبکہ اُردو پر پنجابی اور دیگر زبانوں کے اثرات بھی موجود ہیں۔ بیشتر ہند آریائی زبانوں نے سنسکرت سے خوشہ چینی کی ہے جبکہ پاکستان کی ہند آریائی زبانوں پر عربی اور فارسی کے اثرات بھی موجود ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اُردو لغت، جلد یازدہم، کراچی: اُردو لغت بورڈ ۱۹۹۰ء، ص ۱۹

۲۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، ص ۵۸۹

۳۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، لاہور: مکتبہ معین الادب، طبع سوم ۱۹۶۱ء، ص ۱۳

۴۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، لسانی مقالات (حصہ سوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳

۵۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹

۶۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۳۶

۷۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۵۲

۸۔ گیان چند جین، عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱

۹۔ ڈاکٹر نصیر احمد خان (مترجم) ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے؟، لاہور: نگارشات ۱۹۹۷ء، ص ۶۴

۱۰۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۱۴۰

۱۱۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۴۴۷

۱۲۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص ۲۱۲

اُردو زبان

اُردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے عام خیال یہ ہے کہ یہ ان غیر ملکیوں کی بدولت وجود میں آئی جو کسی نہ کسی دور میں ہندوستان پہنچے۔ یہاں آمد کے بعد مقامی افراد سے ملاپ کے نتیجے میں مقامی بولیوں اور غیر ملکی افراد کی زبان کے ملاپ سے ایک تیسری زبان پیدا ہوئی جسے اُردو کا نام دیا گیا اور یہ بھی کہ بدیسی افراد کی آمد سے یہ زبان خود بخود وجود میں آ گئی۔ ماہرینِ لسانیات نے ان نظریات کو سامی، مسلم آریائی اور آریائی کے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ سامی نظریے کے مطابق عربی اور دکن کی مقامی بولی کے امتزاج سے اُردو زبان وجود میں آئی۔ مولانا نصیرالدین ہاشمی اس نظریے کے حامی ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا موقف ہے کہ محمد بن قاسم اور اس کے ساتھیوں کی آمد کے بعد ان کی اور سندھ کی مقامی بولیوں کے ملاپ سے جو زبان پیدا ہوئی اسے اُردو کا نام دیا گیا۔ حافظ محمود شیرانی کا نظریہ مسلم آریائی نظریے میں شمار ہوتا ہے جس کے مطابق محمود غزنوی کی آمد کے بعد مسلمان ابتدا میں پنجاب میں آباد ہوئے جہاں فارسی اور پنجاب کی مقامی زبان کے امتزاج سے اُردو زبان کا وجود ممکن ہوا۔

ان نظریات کے مطابق اُردو کا آغاز مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد

ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو زبانوں کے ملاپ سے کبھی ایک مکمل اور منضبط زبان پیدا نہیں ہوسکتی اور اُردو دنیا بھر میں انسانوں کی ضروریات کو بخوبی پورا کررہی ہے۔ ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ صرف مغربی ہندوستان ہی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک نئی زبان کے وجود میں آنے کا نظریہ کیوں پیش کیا گیا جبکہ مسلمان مشرقی ہندوستان میں بھی پہنچے اور وہاں بھی بطور فاتح ان کے عوام کے ساتھ تعلّقات قائم ہوئے۔

دکن میں مسلمانوں کی آمد آٹھویں صدی عیسوی میں جبکہ دکنی ادب کا وجود پندرہویں صدی عیسوی میں ملتا ہے اس طرح تقریباً چھ سو سال کے درمیانی عرصے کا کوئی لسانی نمونہ نہیں ملتا۔ منطقی طور پر دکن میں مسلمانوں کی آمد اور دکنی ادب کی ابتدا میں کوئی تاریخی ربط نظر نہیں آتا اس لیے سلاطینِ دہلی کی فتوحات کے نتیجے میں لسانی لہروں نے دکن کا رُخ بھی کیا اور دکنی ادب پر شمالی ہند کی پنجابی اور ہریانی زبانوں نے اپنے اثرات مرتب کیے لیکن اس کے باوجود دکنی ادب اُردو سے بہت حد تک مختلف خیال کیا جاتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات اپنے تجزیاتی مطالعات میں دکنی ادب کو اُردوئے قدیم تسلیم نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ اس بنیاد پر پیش کیا جانے والا اُردو کی ابتدا کا نظریہ بھی درست تصور نہیں کیا جاتا۔

ہندوستان کی کوئی سی دو زبانوں میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کی طرز پر اختلاف نہیں مل سکتا لیکن ان کی جزدی مشابہت کی بنیاد پر یہ قیاس کرنا کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے، درست نہیں۔ اُردو کی معاصر زبانوں میں کوئی بھی زبان قدیم و جدید کے حصوں میں اس طرح تقسیم نہیں ہے جیسے بعض ناقدین اُردو کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر ماہرینِ لسانیات اس مفروضے کو رد کرتے ہیں، ڈاکٹر سہیل بخاری کے بقول:

”دکنی ادب کو اس لیے بھی اُردوئے قدیم نہیں مانا جاسکتا کہ اس کے

عہد سے بہت پہلے مرہٹہ دیس کے شاعروں۔۔۔نام دیواور گیا نیشور
(معاصر حضرت امیر خسرو) کے یہاں اسی اُردو کے نمونے ملتے ہیں
جو آج بولی جارہی ہے جبکہ دکنی ادب آج اُردو کے بڑے بڑے
عالموں کی سمجھ میں بھی پوری طرح نہیں آتا۔اس کے علاوہ آج کی
اُردو کے جلوے عہدِ اکبری کے شاعروں اور نثر نگاروں کے یہاں بھی
نظر آتے ہیں۔اب یہ بات دوسری ہے کہ دیوناگری لپی میں قلم بند
ہونے کے باعث یہ نمونے عام اُردوداں طبقے کی نگاہوں سے ابھی
تک اوجھل رہے ہیں لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جاسکتی کہ
آج کی اُردو کا سراغ دکنی ادب سے بھی بہت پہلے مل جاتا ہے۔"(۱)

کسی زمانے میں اُردو کو فارسی کی بیٹی کہا گیا اور بعد میں اس کا رشتہ سنسکرت سے جوڑ دیا گیا۔فارسی اور سنسکرت کی اصل کو بھی ایک قرار دیا گیا۔لیکن برصغیر کی تمام زبانوں میں ایک دوسرے سے اختلافات موجود ہیں اس لیے سنسکرت کو ان سب کا ماخذ قرار دینا حماقت ہے۔اگر تمام موجودہ زبانوں کو آریائی قرار دیا جائے تو ان میں اور ایرانی زبان میں قریبی مماثلت ضروری ہے جبکہ ہندوستانی اور ایرانی زبانوں میں واضح اختلافات نظر آتے ہیں۔بعض محققین کا موقف ہے کہ اُردو ویدک زبان سے اخذ کی گئی ہے اور سنسکرت ویدک کی ایک اضافی صورت ہے۔یہ نظریہ بھی غلط قرار دیا جاچکا ہے کہ آریوں کی آمد کے بعد شمالی ہند کی دراوڑی زبانیں یکسر ختم ہوگئی تھیں اور ان کی جگہ ویدک (جسے سنسکرت کی قدیم شکل قرادیا جاتا ہے) نے لے لی۔یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر ایرانی اور ویدک ایک ہی زبان کی دو قدیم صورتیں ہیں تو دونوں کو مکمل طور پر ایک دوسرے میں گھل مل جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہ ہوسکا اور آج تک رگ وید کا کوئی بھجن مکمل طور پر اوستا کی زبان میں منتقل نہیں ہوسکا۔اسی طرح ابھی تک اوستائی گرامر

کے ذریعے رگ وید کی مکمل تشریح بھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔

نہ صرف اُردو بلکہ ہندوپاک کی کوئی بھی زبان آریائی تسلیم نہیں کی جاتی۔ رگ وید میں فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے ہزاروں الفاظ موجود ہیں لیے ویدک کال میں اُردو کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کے اُردو کے ویدک زبانوں کے ساتھ تعلق کا نظریہ پیش کر دیا جائے۔ درحقیقت اُردو آریاؤں کی آمد سے قبل بھی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ فارسی اور دیگر مقامی زبانوں کی طرح اُردو الفاظ بھی رگ وید کے بھجنوں میں نظر آتے ہیں۔ تشریح رگ وید میں درپیش مشکلات کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری رقم طراز ہیں:

> ''اس ایک کتاب میں دو سو سے اوپر شاعروں کے بھجن شامل ہیں اور یہ شعرا ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے بسنے والے تھے بلکہ ان میں سے کچھ تو ایک ہی خاندان کی تین تین پشتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مکان وزماں کے اس تفاوت کے ساتھ انھوں نے اپنے بھجنوں میں ایرانی زبان کے علاوہ اپنے اپنے علاقوں کی رائج الوقت زبانیں بھی استعمال کی ہیں اور یوں رگ وید میں اتنی زبانوں کے نمونے جمع ہو گئے ہیں کہ اس کا مکمل طور پر سمجھ لینا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شارحین جگہ جگہ اٹکتے اور قدم قدم پر لڑکھڑاتے ہیں اور آخر میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم فلاں لفظ، فلاں مرکب۔۔۔ اور فلاں سوکت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔''(۴)

رگ وید میں ہندوستانی اور قدیم فارسی تمام زبانوں کے الفاظ کو حروف کی تبدیلی کے بعد تحریر کیا گیا ہے۔ چونکہ رگ وید ہندوستان اور آریوں کی ایسی قدیم ترین

زبان ہے جس تک ہماری رسائی ہوئی ہے اس لیے اس کتاب میں اُردو الفاظ کی موجودگی
سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ویدک کال سے بہت پہلے اس علاقے میں بولی جارہی
ہے۔رگ وید میں اُردو الفاظ کے بغور جائزے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ
اُردو بول چال کی آوازوں میں زیر زبر کا فرق بھی نہیں آیا۔اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ
اُردو بہت پرانی زبان ہے جس کے مشابہ الفاظ سنسکرت جیسی قدیم زبان میں بھی پائے
جاتے ہیں اور اُردو کی تاریخ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے بھی زیادہ قدیم ہے۔

اُردو میں سنسکرت سے زیادہ پراکرتی عناصر موجود ہیں کیونکہ پراکرتیں برصغیر
کے عوام کی بولیاں تھیں جنھوں نے ارتقائی سفر کے بعد جدید ہندوستانی زبانوں کا
روپ اختیار کرلیا۔اُردو میں پراکرت کی سب سے اعلیٰ روایت یعنی عوامی عنصر موجود
ہے۔یہ ایسی زبان ہے جس کی ترتیب وتشکیل میں برصغیر کے تمام علاقوں کی بولیاں،
لوک گیت اور کہانیاں شامل ہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بقول:

"اُردو قید مقام سے آزاد ہے۔کبھی پنجاب کے لہلہاتے سبزہ زاروں
میں اس نے بچپن گزارا اور کبھی دلّی کی گلیوں اور بازاروں میں اسے
پھرتے دیکھا گیا۔اس کی جوانی کی اٹھان دکن اور گجرات میں ہوئی۔
پھر یہ شمالی ہند میں لوٹی تو دلّی کی شاہی اسے نصیب ہوئی۔دلّی اُجڑ کر
فیض آباد اور لکھنؤ پر رونق آئی تو اس نے پورب دیس کو اپنا مسکن بنایا
لیکن اس کی آواز سرحد کے بلند پہاڑوں، بنگال کے دریاؤں، لہلہاتے
دھانوں کے کھیتوں، سندھ کے روپہلے چمکتے ریتیلے میدانوں، کشمیر کے
سبزہ زاروں اور جوئے باروں میں ہر جگہ سنائی دیتی رہی۔جدید ہندوستانی
پاکستانی زبانوں میں یہ وسعت، ہمہ گیری اور پھیلاؤ اُردو ہی کے حصہ

میں آیا ہے اور آج بھی یہ اس کی ایک ممتاز روایت ہے۔"(۳)

برصغیر کے تقریباً تمام علاقوں کی تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کے ربط وارتباط کے باعث ایک مخلوط کلچر اور ثقافت کی آئنہ دار ہے یہی اثرات اُردو پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ اس کی نشوونما میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ اُردو افعال کی اکثریت سنسکرت، پراکرت اور دیگر دیسی زبانوں پر مشتمل ہے۔ کچھ افعال فارسی سے لے کر ان کا ترجمہ کرلیا گیا ہے لیکن اس پر عربی افعال کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسما میں پچھتر فیصد سے زائد ہندوستانی اور پچیس فیصد غیر ملکی ہیں۔ اس میں بہت سی خصوصیات پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی سے اُردو میں شامل ہوئی ہیں۔ حروفِ ربط، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور دیگر ادبی روایات کا بھی یہی احوال ہے۔ اُردو شعروادب اپنے لب ولہجہ کے حوالے سے برصغیر کی پیداوار ہے۔ یہ سمجھوتے اور مفاہمت کی خصوصیات سے مزیّن زبان ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> "اُردو کی اسی روایت کے پیشِ نظر انشا نے دریائے لطافت میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جو لفظ اُردو زبان میں آگیا ہے وہ اُردو ہے خواہ اصل کچھ ہو اور جس طرح اُردو میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے چاہے از روئے اصل اس کا یہ استعمال غلط ہو اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ وہ تمام الفاظ ولغات جو اُردو میں آگئے اور دخیل ہوگئے اُردو ہیں اور اُردو رہیں گے۔ ظاہر ہے زبان نے اپنی یہ روایت ترک نہیں کردی آئندہ بھی اُردو میں الفاظ اسی طرح دخیل ہوتے رہیں گے اور اُردو کی نشوونما میں ممدومعاون ثابت ہوں گے۔"(۴)

زبان کسی بھی علاقے کے لوگوں پر مسلط نہیں کی جا سکتی بلکہ زبان کے فروغ کا عمل نہایت نرمی کے ساتھ خود اختیاری انداز میں ہوتا ہے۔ فروغِ اُردو میں صوفیائے کرام کا کردار نہایت اہم ہے جن کے دروازے ہمیشہ عوام کے لیے کھلے رہتے تھے۔ عوام کے دلوں کو تسخیر کرنے کے لیے عوامی بولی اختیار کرنا ضروری تھا۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے دین کی تعلیمات کے فروغ کے لیے اُردو زبان کا سہارا لیا۔ فروغِ زبان کے سلسلے میں مذہبی سرپرستی بہت اہم ہے لیکن زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اسے ہر مذہب کے لوگ بول سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، لسانی مقالات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۱ء، ص ۳۶۱

۲۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، لسانی مقالات، ص ۳۶۳

۳۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ادب و لسانیات، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۲

۴۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ادب و لسانیات، ص ۲۰۶

اُردو ــــ ہماری قومی زبان

قومی زبان سے مراد ایسی زبان ہے جس میں کسی بھی قوم کا تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی ورثہ محفوظ ہو۔ قومی زبان پورے ملک کے رہنے والوں کا مشترکہ ذریعہ اظہار ہے۔ چین میں رہنے والوں کے لیے چینی، جاپان میں بسنے والوں کے لیے جاپانی اور فرانس کے باشندوں کے لیے فرانسیسی زبان کی جو اہمیت ہے یقیناً پاکستانیوں کے لیے اُردو زبان اُسی قدر و منزلت کی حامل ہے۔

اُردو کی ابتدا اور ارتقا کا سفر مسلمان حکمرانوں، بزرگانِ دین اور شعرا و ادبا کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ مسلمانوں کے لیے اُردو زبان کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "جدید تر زمانے میں اُردو زبان میں اگرچہ سادگی و سلاست اور روزمرہ نگاری کا رجحان بھی پیدا ہوا مگر ملکی و سیاسی وجوہ روز بروز اُردو کو خالص مسلمانوں کی چیز بناتے چلے گئے' جس کی وجہ سے اُردو مشترک زبان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے احساسات و افکار سے بطور خاص وابستہ ہو گئی۔۔۔۔ اور اُردو بالآخر وہ زبان قرار پائی جس کی ترقی و تعمیر بلکہ تحفظ و بقا کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر آپڑی۔"(۱)

ہماری زبان ہمیں ہمارے عقیدے سے قریب تر کرتی ہے۔ اُردو ہمیں ایشور اور بھگوان کی بجائے اللہ اور خدا کی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے۔ زبان اور عقیدے کا یہ غیر محسوس لیکن اہم تعلق ہماری زندگیوں پر دُور رس اثرات مرتب کرتا ہے۔

قومی زبان کی حیثیت سے اُردو کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ علاقائی زبانوں کے مخصوص دائرہ کار اور اہمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ قومی زبان پر بھرپور توجہ بھی ضروری ہے۔ اُردو برصغیر کے مسلمانوں کا قومی تشخص ہے۔ آزادی کی کوششوں کے دوران میں اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے خاتمے کی جو کوششیں کی گئیں انھیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو زبان کے بارے میں گاندھی جی کا یہ موقف کہ اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی ہے یقیناً قابلِ توجہ ہے۔ قائداعظمؒ نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کی تقریر میں اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے کر پوری دنیا پر اس زبان کی اہمیت واضح کر دی تھی۔ قائداعظمؒ کے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کے جلسہ عام کی تقریر کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ”میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر کوئی غلط یا پریشان کن اثر پڑنے والا ہے۔ بالآخر اس صوبے کے لوگوں ہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ اس صوبے کی زبان کیا ہوگی۔ لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور صرف اُردو اور اُردو کے سوا اور کوئی زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد

نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے، وہ اُردو ہی ہوگی۔''(۲)

قائداعظمؒ نے جلسہ تقسیمِ اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو اُردو زبان کے حوالے سے کچھ مزید ارشادات فرمائے۔ جن کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

''اس صوبے میں دفتری استعمال کے لیے، اس صوبے کے لوگ جونسی زبان بھی چاہیں، منتخب کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ خالصتاً صرف اس صوبے کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق حل ہوگا۔ البتہ پاکستان کی سرکاری زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو، صرف ایک ہی ہو سکتی ہے، اور وہ اُردو ہے۔ اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔

اُردو وہ زبان ہے جسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے پرورش کیا ہے، اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے، یہ وہ زبان ہے جو دوسری صوبائی اور علاقائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کے بہترین سرمایے پر مشتمل ہے اور دوسرے اسلامی ملکوں کی زبانوں سے قریب تر ہے۔ یہ بات بھی اُردو کے حق میں جاتی ہے اور یہ بہت اہم بات ہے کہ بھارت نے اُردو کو دیس نکالا دے دیا ہے حتیٰ کہ اُردو رسم الخط کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔''(۳)

پاکستان کے پہلے دستور ۱۹۵۶ء میں دو زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دینے کے بعد اُردو کا مسئلہ زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا لہٰذا مناسب ہوگا کہ اس دستور کے منتخب متن پر ایک نظر ڈال لی جائے:

''۱۔ جمہوریہ کی سرکاری زبانیں اُردو اور بنگلہ اور ایسی دوسری صوبائی زبانیں ہوں گی جنھیں متعلقہ صوبائی اسمبلی کی سفارش پر صدرِ مملکت یہ حیثیت دینے کا اعلان کردے۔

۲۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو انگریزی کے علاوہ، اُردو اور بنگلہ میں تقریر کرنے کا حق ہوگا۔

۳۔ مندرجہ بالا دفعات کے باوجود، آئین کے نفاذ کے بعد بیس سال کے عرصے کے لیے انگریزی کو حسبِ سابق تمام سرکاری معاملات کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

۴۔ مرکزی ملازمتوں کے امتحانات کے لیے صوبائی زبانوں کو مساوی درجہ دیا جائے گا۔

۵۔ ثانوی سکولوں میں عربی، اُردو اور بنگلہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا تاکہ طلبہ اپنے ذریعۂ تعلیم کے علاوہ ان میں سے بھی ایک یا دو زبانیں سیکھ لیں۔

۶۔ حکومت ایک مشترکہ قومی زبان کی ترقی و فروغ کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔

۷۔ آئین کے نفاذ کے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو انگریزی کی جگہ متبادل انتظام کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔''(۴)

اس دستور کی خطرناک لسانی شقوں نے پاکستان کے لیے خطرات کے دروازے کھول دیے اور قائداعظمؒ کے قومی زبان کے تصورات کی واضح نفی کر کے ملکی سالمیت اور خودمختاری کے خلاف منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا سنگِ بنیاد رکھ دیا۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں اُردو کو قومی زبان کی حیثیت دی گئی اور اسے سرکاری

مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے اندر انتظامات کا اعلان کیا گیا۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ قومی زبان کے منصب کو کسی قسم کا گزند پہنچائے بغیر صوبائی اسمبلیوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ قومی زبان کے ساتھ قومی زبان کی ترقی' استعمال اور تعلیم کے لیے مناسب قوانین بنا سکیں۔ انتظامات مکمل ہونے تک انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ دستور کے وعدے کے مطابق ۱۹۸۸ء تک اُردو کو سرکاری کاموں کے لیے تیار کرلیا جانا تھا مگر تا حال اس تیاری کے واضح اثرات نظر نہیں آرہے۔ اُردو سرکاری نہ سہی مگر ہماری قومی زبان ضرور ہے اور اسے سرکاری بنانے کا وعدہ بھی ہے۔ حال ہی میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے ان تمام اداروں کی تفصیلات طلب کرلی ہیں جو اُردو کو سرکاری زبان بنانے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اس ضمن میں جلد ہی کوئی مثبت پیش رفت ہوگی۔

اُردو شائستگی، روشن خیالی اور قومی شعور کی حامل زبان ہے۔ مادری زبان سب کو عزیز ہوتی ہے لیکن قومی زبان کی اہمیت اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ قومی زبان کی حدود وسیع ہیں اس لیے فطری طور پر حلقۂ اثر بھی وسیع ہوگا۔ بعض دانشوروں کے دلوں میں یہ بات گھر کرگئی ہے کہ اگر اُردو ان کے صوبوں میں مقبول ہوگئی تو اس سے مقامی زبان کو نقصان پہنچے گا۔ یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ قومی زبان مقامی زبانوں کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنر بخوبی جانتی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی اس یادگار کو تقسیم کے وقت جس بے دردی سے دیس نکالا ملا اُس سے اس زبان کے مخالفین مطمئن ہوگئے تھے کہ جلد ہی یہ زبان اپنی آب و تاب کھو دے گی لیکن دنیا نے دیکھا ہماری زبان زندہ ہے۔ اُردو ہمیشہ زندہ رہے گی اور

ترقی کرے گی۔ ان شاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اُردو ایشیا کی عام زبان بن جائے گی اور پورے براعظم میں یکساں انداز سے بولی اور سمجھی جائے گی۔

اُردو کو بطور ذریعہ تعلیم اپنانے اور غیر ملکی زبانوں کو ثانوی حیثیت دینے سے اہلِ وطن کا اپنی زبان پہ ڈگمگاتا اعتماد بحال ہوگا۔ انٹرمیڈیٹ تک اُردو کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے لیکن بی اے کی سطح پر انگریزی کو اس پر فوقیت دی گئی ہے۔ اگر بی اے کی سطح پر اُردو کو لازمی اور انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی جائے تو اس سے معیارِ تعلیم بہتر ہوسکتا ہے۔ اسی طرح پاکستانی جامعات میں چار سالہ بی ایس پروگرام بھی کامیابی سے جاری ہے۔ اگر ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان اس پروگرام کے مجوزہ نصاب میں اُردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کرلے تو یہ انتہائی مثبت عملی اقدام ہوگا۔ ملک کے بڑے شہروں میں جدید تکنیک کے مطابق کتب خانوں کا قیام (جہاں اُردو زبان و ادب، تاریخ، تحقیق و تنقید کے حوالے سے قدیم اور جدید کتب موجود ہوں) اُردو کے فروغ کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوگا۔ اعلیٰ درجے کی تعلیم میں طالب علموں کو انگریزی یا اُردو میں امتحان کا اختیار حاصل ہونا چاہیے تاکہ وہ طالب علم جو اُردو میں امتحان کو سہولت خیال کرتے ہیں ان کے لیے بھی یکساں مواقع مہیا کیے جاسکیں۔

سائنس کے تجرباتی علم کو کتابی علم کے دائرے سے نکال کر پیش کرنے کے لیے قومی زبان سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ اُردو زبان کو وہ مقام نہ دینا جس کی وہ حق دار ہے ایک غیر فطری عمل ہے۔ قومی زبان کو عملی طور پر لاگو کرنے سے ہی اس میں وہ صلاحیتیں پیدا ہوں گی جن کے ہم خواہاں ہیں۔ اُردو کو عملی زندگی میں (اپنے وسیع تر تناظر میں) اپنا پہلا قدم اٹھانے کی اجازت درکار ہے۔ اس سلسلے میں پرنٹ اور

الیکٹرانک میڈیا کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمسایہ ملک کے میڈیا نے اپنی زبان اور ثقافت کی تشہیر کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے' ہمیں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا ہے تاکہ اپنی زبان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

انگریزی کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس کی بے جا بالادستی کو ختم کر کے اور قومی زبان کو فروغ دے کر ہی خواص اور عوام کے درمیان (دو مختلف زبانوں کے باعث پیدا ہونے والی) خلیج کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی نیم پلیٹ، خط کتابت، دعوتی کارڈ، رقعے اور انگریزی گفتگو فیشن بن چکے ہیں۔ اُردو کا دامن وسیع ہے وہ ان تمام حوالوں سے اپنی خدمات پیش کر سکتی ہے۔ قومی زبان میں انگریزی کے بے جا پیوند ہمارے احساسِ کمتری کا ثبوت ہیں۔ اسی حوالے سے علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ

> ''فی زمانہ انگریزی زبان کی طرزِ تحریر اُردو زبان پر بہت بڑا اثر کر رہی ہے۔ موجودہ اُردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند اُردو مصنفین کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ ان کی تحریروں میں آتے جاتے ہیں۔ (مثلاً توبتہ النصوح کے مصنف نے الفاظ انٹرنس، فری میسن، ربڑ، پنسل، ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا ہے) اور ان کی طرزِ تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرزِ ادا سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائے گا۔''(۵)

شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور محققین کی سرکاری سرپرستی سے اُردو کے موجودہ منظرنامے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اُردو کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ وہ

انگریزی پرست طبقہ ہے جو انگریزی کے توسط سے اپنی بالادستی کا خواہاں ہے۔ نئی نسل کے ذہنوں سے اس احساسِ کمتری کو دور کرنا بہت ضروری ہے جو اُن کے بزرگوں نے اُردو کے حوالے سے انھیں تحفے میں دیا ہے۔ یہ ادراک کہ اُردو ہماری شناخت ہے، ہماری قومی زبان اور ہمارا مستقبل ہے، لمحہ موجود کا اولین تقاضا ہے۔ پاکستان، پاکستانی اور اُردو ایک ایسی مثلث ہے جس کا ہر کونا دوسرے کے لیے ناگزیر ہے۔

قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

"اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر کامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اُردو اور صرف اُردو ہے۔"(۹)

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مباحث، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۱۴۵

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، تحریکِ نفاذِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص ۴۸

۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۴۔ صفدر محمود، مسلم لیگ کا دورِ حکومت، لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۶۔۲۴۷

۵۔ اقبال، مقالاتِ اقبال، سید عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی (مرتبین)، لاہور: القمر انٹرپرائزز، ۲۰۱۱ء، ص ۴۹

۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، تحریکِ نفاذِ اردو، ص ۴۹

روزگار کے مسائل اور اُردو کا مستقبل

اگر امیر خسرو سے منسوب اُردو شاعری کے قدیم نمونوں سے اُردو زبان و ادب کی قدامت کا اندازہ لگائیں تو یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ اُردو نے اب تک کم و بیش سات صدیوں کا سفر طے کر لیا ہے۔ گزشتہ اڑھائی تین صدیوں سے تو اس زبان میں نثر اور نظم کی ان کتابوں کا سراغ بھی تسلسل سے نظر آتا ہے، جو تحقیق اور وقت کی ہر کسوٹی پر پورا اترتی ہیں اور جو اُردو زبان و ادب کا ایسا زندہ سرمایہ ہیں جن کی توثیق ہر آنے والے زمانے نے کی ہے۔ صدیوں پر محیط اس ارتقائی سفر میں اُردو نے تخلیق، تحقیق اور تنقید سے لے کے اظہار و اسلوب اور تشریح و تفسیر کے حوالے سے باکمال خدمات انجام دی ہیں۔ عہد بہ عہد معاشرے میں اس کی ضرورت و اہمیت بڑھی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں رابطے کی زبانوں کے گراف میں اس کا کام، نام اور مقام اونچا ہے۔ ابلاغیات کی موجودہ صورت حال میں اس خطے میں اُردو کی اہمیت نہ صرف یہ کہ نمایاں ہے بلکہ اس میں ترقی روز افزوں ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں سے لے کے اخبارات و رسائل کی اشاعت تک میں اس کا مکمل عمل دخل نمایاں اور مؤثر ہے۔ رابطے کی زبان کے طور پر (Langua Franca) اُردو ہی واحد زبان ہے

جو متعدد جغرافیائی اکائیوں، علاقوں، حوالوں، لسانی شناختوں اور مختلف تہذیبی وحدتوں کو ایک متحرک، زندہ اور روز افزوں نسبت میں پروئے ہوئے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُردو کا یہ کردار اس کی اپنی قوتِ نمو اور داخلی قوت اور اہمیت کے اعتبار سے ہے۔ سرکاری سطح پر اس کی وہ پذیرائی نہیں جو اس کا آئینی اور جائز حق ہے۔ تاہم اپنی لسانی خصوصیات، مزاج اور اہمیت کے سبب اسے (Langua Franca) کا درجہ حاصل ہے۔

Langua Franca کی بھی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک عمومی حیثیت جس میں عوام الناس اسے بول چال میں برتتے ہیں۔ لب ولہجہ کے فرق اور غلط سلط تلفظ کے ساتھ ہی سہی اس کے خدوخال اور خارجی چہرہ کسی نہ کسی طور برقرار رہتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور سرکار دربار کی توجہ اور تعاون کے بغیر یہ اپنا کام جاری رکھتی ہے۔ معاشرے میں اس کا عمل دخل برقرار رہتا ہے۔ اس کی دوسری حیثیت اس زبان سے خاص نسبت رکھنے والے اہلِ علم کی ہوتی ہے جو اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تنقید کرتے ہیں۔ اس کی جڑوں سے لے کے اس کے امکانات تک پھیلے ہوئے معاملات و مسائل پر غوروخوض کرتے رہتے ہیں۔ اس کے تلفظ، قواعد و اسالیب کو زیرِ بحث لاکر اس کی تہذیب کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ خاص طبقہ جو کسی زبان کی جداگانہ شناخت اور ترقی کا باعث ہوتا ہے اس زبان کے اہلِ دانش ہوتے ہیں۔ گزشتہ صدی میں اُردو کے حوالے سے یہ فریضہ زیادہ تر اساتذہ نے نبھایا۔

اُستادوں (Educationists) کو یہ (Credit) تو بہرحال جاتا ہے کہ انھوں نے ہر زمانے میں کسی نہ کسی طور علم کو زندہ اور اس کی ترسیل کو بحال رکھا۔ اُردو کی حد تک یہ بات بہت درست معلوم ہوتی ہے۔ گزشتہ صدی میں سیکڑوں اساتذہ ہیں

جنھوں نے تنقید و تحقیق کے باب میں یہ فریضہ انجام دیا (تخلیق کی بات اس سے کچھ مختلف ہے)۔ مولوی شفیع، حافظ محمود شیرانی، کلیم الدین احمد، سیّد احتشام حسین، آلِ احمد سرور، رشید حسن خان، گوپی چند نارنگ، غلام مصطفیٰ خاں، سیّد عبداللہ، سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔۔۔ ایک طویل فہرست ان ناقدین، محققین اور ریسرچ سکالرز کی ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی حصے بلکہ اکثر عمر بھر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسی کتنی شخصیات ہیں جو اپنے طور پر تحقیق و تنقید کے کاموں سے وابستہ رہیں۔ گزشتہ صدی میں اُردو زبان و ادب کی درس و تدریس کی جو صورتِ حال تھی کیا آئندہ بھی ویسی رہے گی اور کیا آئندہ جامعات سے وابستہ افراد تنقید و تحقیق کے اس معیار کو قائم رکھ سکیں گے جو معیار ان فاضل اساتذہ کے نتائج فکر اور تلاش و تحقیق نے اُردو زبان و ادب کو دیا۔۔۔ میری دانست میں جب تک اس بارے میں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں ہوگی آئندہ ہماری جامعات ان معیارات سے دُور رہیں گی۔ آج کا تدریسی منظرنامہ گزشتہ صدی تو کیا گزشتہ ربع صدی سے قطعی مختلف ہے۔ جب سے زندگی اور معاشرتی قدروں کو روپیہ پیسہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ تحصیلِ تدریس اور علم کے رویے بھی بُری طرح متاثر ہوئے ہیں۔

موجودہ منظرنامے میں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں نئے تقاضوں اور مطالبات کے سامنے یہ زبان کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ نیز روز بروز معاش سے کٹتی ہوئی اُردو زبان کو مستقبل کے منظرنامے میں بھی دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور دوسرے Job Oriented Subjects (معاش سے وابستہ علوم و فنون) کی طرح مستقبل کے معاشی خاکے میں اُردو خواں طبقے کے لیے بھی کوئی بہتر مقام پیدا کرنے کی تجاویز پر اُردو کے تمام اداروں کو

غور و خوض کرنا چاہیے۔

کیا اُردو کا موجودہ تدریسی نظام انھیں خطوط پر استوار ہے جن خطوط پر آج کی ترقی یافتہ زبانوں انگریزی، چینی، جاپانی وغیرہ کا تدریسی نظام ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں زبانوں کا چلن بھی ہم سے مختلف ہے۔ ہمارا زیادہ زور زبانوں سے وابستہ شخصیات کے احوال و آثار اور ان سے وابستہ افکار و نظریات کے مطالعہ پر ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں زبانوں کی تدریس کا بڑا حصہ عملی زندگی میں ان کے ربط اور افادیت سے وابستہ ہے۔ ہمیں اپنی جامعات میں بڑی تیزی کے ساتھ بیسیوں ایسے نئے کورسز متعارف کرانے ہوں گے جو زبان و ادب کی آگہی کے علاوہ عملی زندگی اور بین الاقوامی معاشرت کے تقاضوں سے جڑے ہوئے ہوں۔

اُردو زبان کو معاشی و معاشرتی نظام سے وابستہ کرنے کی شعوری کوشش اور ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے اور اُردو زبان کے حوالے سے ادبی قدر و قیمت کے تعین کے مسئلے کو جس طرح اہمیت دی جاتی ہے اسی طرح زندگی کے تمام شعبوں سے منسلک رہنے والی اس زبان کے عملی پہلوؤں پر غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ ہر سطح پر روزگار کے مواقع پیدا کیے جا سکیں مثلاً دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمان تیار کرنے کا منصوبہ۔ مختلف ممالک کے سفارت خانوں میں اُردو زبان سے جُڑے ہوئے پریس تیار کرنے کا منصوبہ۔ ٹی وی/ریڈیو اور صحافت کے علاوہ آرٹ موویز میں کام کرنے والے اداکاروں، ڈب کرنے والے نیز پرفارمنگ آرٹس سے وابستہ لوگوں کی لسانی تربیت کے کورسز۔ اسی طرح میڈیکل کمپنیوں کے بروشر اور معلوماتی کتابچے تیار کرنے کے لیے اُردو خواں طبقہ کی موجودگی۔۔۔ ایسے کئی شعبے ہیں جن کے لیے خصوصی طور پر کورسز ڈیزائن کیے جا سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ملنے والی معلومات سے

پتا چلتا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں بچوں کی کارٹون فلموں کو اپنی زبان میں ڈب کرنے کی صنعت یا پیشے سے وابستہ لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

فلموں کے ترجمہ اور ڈبنگ کے لیے عربی اور فارسی زبانوں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد مصروف کار ہیں۔ اُردو میں اس سے کہیں بڑھ کر مواقع موجود ہیں۔۔۔ یہ واضح رہے کہ اسی معاشرے اور ملک کی زبان بھی مضبوط ہے جس کی معیشت مضبوط ہے۔ معاشرے کے باقی پہلوؤں کی طرح زبان کا مسئلہ بھی معیشت سے وابستہ ہے اور مستقبل میں یہ وابستگی اور زیادہ پختہ ہوتی جائے گی۔ انفرادی کوششوں کے ذریعے شاید زبان کی خدمت نہ ہو سکے۔ اس کے لیے مشترکہ طور پر ایسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس میں حکومتی ادارے اپنا پورا حصہ اور وسائل ڈالیں۔

تہذیبی اور ثقافتی اداروں کو مضبوط کیا جائے۔ مختلف جامعات میں ترجمہ سے وابستہ نئے ادارے کھولے جائیں۔ نئے کورسز جیسے گریجوایشن کی سطح پر بزنس اسٹڈیز اور فائنانس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی وغیرہ کے کورسز اُردو میں ڈیزائن کیے جائیں۔ جامعات سے فارغ التحصیل طلبا و طالبات کے لیے لیکچرر شپ کے علاوہ سینکڑوں نئی بہتر ملازمتوں کو تحصیلِ اُردو سے وابستہ کیا جائے۔ بالخصوص انھیں اس بات کا احساس بھی دلایا جائے کہ اُردو تعلیم کا مطلب صرف کالج اور سکول میں استاد بننا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس وسیع ہوتی دنیا میں نئے مقامات اور منازل کی کوشش خود ہی کرنی ہے۔ اس وابستگی میں معاشی کشش کو نظر انداز نہ کیا جائے تاکہ ذہین لوگ روزگار سے وابستگی میں اطمینان محسوس کر سکیں۔ اگر ہم اُردو کی تعمیر و ترقی کے لیے ایسا آبرومندانہ نظام وضع کر سکیں تو یہ اُردو کی خدمت بھی ہوگی اور اس وسیلے سے ہماری معاشرت و معیشت میں اُردو دوست حضرات کو ایک بہتر مقام اور اعتبار حاصل ہو سکے گا۔

لسانیات کا تعارف اور
لسانیاتی مطالعے کی اہم شاخیں

لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقا، زندگی اور موت کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ زبان کے بارے میں منظم علم کو لسانیات کہا جاتا ہے۔ یہ ایسی سائنس ہے جو زبان کو اس کی داخلی ساخت کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان میں اصوات، خیالات، سماجی صورتِ احوال اور معنی وغیرہ شامل ہیں۔ لسانیات میں زبان خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ اشاروں کی زبان یا تحریر لسانیات میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتی۔ لسانیات میں زبانی کلمات کے مطالعے کو تحریر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں۔

ا۔ انسانی تہذیب کے ارتقا میں انسان زبان پہلے بولنا شروع ہوا اور تحریر بہت بعد میں ایجاد ہوئی۔

۲۔ بچہ پہلے بولنا شروع کرتا ہے اور بعد میں لکھنا سیکھتا ہے۔

۳۔ دنیا میں سب ہی انسان بولنا جانتے ہیں لیکن مقابلتاً کم لوگ لکھنا جانتے ہیں۔

۴۔ بہت سی ایسی چیزیں جو زبانی گفتگو میں شامل ہوتی ہیں، تحریر میں ظاہر نہیں کی جاتیں۔

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے بقول:

''لسانیات (Linguistics) کا اُردو ترجمہ ہے۔ فلالوجی (Philology) کی اصطلاح بھی لسانیات کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن فلالوجی نسبتاً ایک وسیع تر اصطلاح ہے جس کے مفہوم میں زبان کے سائنسی مطالعہ کے علاوہ ادبیات کا سائنسی مطالعہ بھی شامل ہے۔''(۱)

محی الدین قادری زور نے لسانیات کو زبان کی پیدائش، ارتقا اور موت سے متعلق علم قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقا، زندگی اور موت کے متعلق آگاہی ہوتی ہے۔''(۲)

لسانیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسانی زبان سے ہی متعلق ہے اس میں ہم کسی دوسرے نظام کا مطالعہ نہیں کرتے مثلاً جانور بھی آپس میں بات چیت کرتے ہیں لیکن لسانیات میں سوائے انسانی زبان کے کسی اور طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔ یہ انسان کے لیے ہی ممکن ہے کہ وہ لاتعداد جملے بول سکے اور وہ ایسے ایسے فقرے بولتا اور سمجھتا ہے جو اس سے پہلے کبھی کسی نے بولے یا سنے نہ ہوں۔ گزشتہ نصف صدی کے عرصے سے صرف ونحو کے مسائل نئے انداز سے دیکھے جا رہے ہیں۔ دن بدن ان مسائل کے بارے میں نت نئے نقطۂ نظر سامنے آرہے ہیں اور لسانیات نسبتاً ایک نیا علم ہونے کے باوجود آج زبان و ادب، عمرانیات، بشریات، نفسیات، فلسفہ، ریاضی اور مشینی ترجمے کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں لسانیات

کی مدد سے تاریخ، تہذیب اور معاشرت کے بہت سے مسائل حل کیے جا رہے ہیں۔

لسانیات کی مدد سے مختلف نسلوں اور زبانوں کا باہمی اشتراک و اختلاف معلوم کیا جا رہا ہے اور اس سے قوموں اور زبانوں کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔ ڈیوڈ کرسٹل لکھتے ہیں کہ

> ''ہم ایک زبان کو کسی ایسے گز سے نہیں ناپ سکتے جو دوسری زبانوں سے مستعار لیا گیا ہو۔ اگر کوئی قبیلہ اپنی زبان میں اتنے لفظ نہیں رکھتا جتنے انگریزی میں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انگریزی سے زیادہ قدیم یا غیر مہذب زبان ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس زبان میں زیادہ الفاظ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے کافی الفاظ رکھتی ہے۔ اس زبان کے بولنے والے مثلاً انگریزی کی طرح تکنیکی اصطلاحوں کی اتنی بڑی تعداد میں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اگر کوئی قبیلہ معاشی ترقی کے زیرِ اثر تکنیکی چیزوں کے ربط میں آئے گا تو نئے الفاظ اختراع کر لیے جائیں گے یا مستعار لے لیے جائیں گے۔ اس طرح ان کا کام چل سکتا ہے۔۔۔ زبان اپنے بولنے والوں کی سماجی ترقی کے قدم بہ قدم چلتی ہے۔''(۳)

لسانیات کے ذریعے یہ بھی معلوم کیا جاتا ہے کہ کس قوم یا زبان نے کس علاقے کا سفر کیا اور وہ اثر اندازی اور اثر پذیری کے عمل سے کس حد تک دوچار رہی ہے۔ قدیم اور مردہ زبانوں کے رسم الخط اور ادب کی تفہیم بھی لسانیات کی مدد سے ممکن ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جن زبانوں کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں، لسانیات انھیں رسم الخط بھی عطا کرتی ہے اور موجودہ رسم الخط میں موجود خامیوں کو دور کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ لسانیات ایسے نشانات وضع کرتی ہے جن کی مدد سے عبارت کو

دوسری زبان میں آسانی سے لکھا جاسکتا ہے۔اس طرح ہر زبان اب حقیقی تلفظ کے
ساتھ لکھی جاسکتی ہے۔لسانی وادبی تحقیق میں مخطوطات کا زمانی تعین بہت اہمیت
رکھتا ہے۔لسانیات کے بعض اصولوں کی مدد سے مخطوطات کے زمانی تعین میں بھی مدد
ملتی ہے اور اس کی مدد سے ایسے قواعد بھی بنائے جارہے ہیں جن کے ذریعے کسی
دوسری زبان کو بہت کم عرصہ میں سیکھا جاسکتا ہے۔

لسانیات کی افادیت کے پیشِ نظر ترقی یافتہ ممالک میں اسے خاطر خواہ
اہمیت دی جارہی ہے اور اسے ریاضی اور شماریات کے انداز میں وضع کیا جارہا ہے۔
اسے افواج میں فوجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بھی استعمال کیا جارہا ہے اور اس کے
ذریعے خفیہ الفاظ بنانے اور دوسروں کے خفیہ الفاظ پڑھنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔
مغربی ممالک میں لسانیات کو کمپیوٹر پروگرام میں شامل کیا جارہا ہے اور اس کی مدد سے
ترجمہ کرنے کی ایسی مشین بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو ایک زبان سے دوسری
زبان میں ترجمہ کرسکے۔اس طرح اب ایک زبان کا مختلف زبانوں میں مشین کے
ذریعے چند ثانیوں میں ترجمہ ہوسکے گا۔

آج کے دور میں لسانیات نے زبان کے تاریخی جائزوں کی سرحدوں سے
باہر نکل کر ریاضی اور سائنس کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کرلی ہے۔اب زبانیں
اپنے مخصوص دائروں میں محدود نہیں رہ سکتیں۔تہذیبی انقلاب،لسانی تبدیلیوں اور
صنعت وسائنس کی بے پناہ ترقی میں انھیں اپنے لیے جگہ متعین کرنی ہوگی۔ماضی کی
طرف نگاہ رکھنا ضروری سہی لیکن زمانے کی رفتار کے پیشِ نظر مستقبل سے صرفِ نظر
نہیں کیا جاسکتا۔زندہ رہنے کے لیے مستقبل کے تقاضوں کو قبول کرنا ہوگا۔ہم نے
اُردو کے آغاز کے نظریوں کو سب کچھ سمجھ لیا ہے جبکہ فروغِ لسانیات کی طرف سنجیدگی

سے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ ایچ ای سی کے زیرِ نگرانی ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو لسانیات کو علمی مدارج پر فروغ دے۔ اس ادارے کے تحت لسانیات کی تدریس پر توجہ دینی چاہیے اور یہ ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کو یقینی بنائے جن سے لسانیات اور اس کی افادیت زبان و ادب کے طالب علموں پر اُجاگر ہو سکے۔

لسانیاتی حوالے سے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ بہروں کے لیے ایک قسم کا بصری آلہ تیار کیا جائے جو سمعی صوتیات کی مدد سے حاصل کردہ معلومات پر مشتمل ہو۔ ایسی مشین پہلے ہی تیار ہو چکی ہے جو تکلمی آوازوں کی تصویر تیار کر سکتی ہے اگرچہ یہ تصویر پیچیدہ ہوتی ہے اور اسے پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس مشین کو Sound Spectragraph کہتے ہیں۔ اگر مختلف آوازوں کی تصاویر آسانی سے پہچانی جانے والی ترتیب وار شکلوں کے سلسلوں میں آسکیں تو تکلم کو براہِ راست تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ ہم ایسی مشین کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں جس میں مائیکروفون اور پردہ لگا ہو مائیک پر بات کرنے کے بعد پردے پر تصویر آجائے جس سے بہرہ فرد نئے حروفِ تہجی سیکھنے کے بعد گفتگو کو براہِ راست پڑھ کر فوراً سمجھ سکتا ہے۔ اس تکنیک کو کاروباری منصوبوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے مزید تحقیقاتی کام کی ضرورت ہے۔

پروفیسر گیان چند جین کے بقول:

> ''لسانیات روایتی قواعد کی اصطلاحوں کو نہیں اپنا سکتی کیونکہ لسانیات کی اصطلاحیں بالکل وہی مفہوم پیش نہیں کرتیں۔ تکنیکی مطالعے میں اصطلاحیں ناگزیر ہیں۔''(۴)

لسانی فردیات میں فرد کے جسمانی آغاز و ارتقا کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے۔ اس میں اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ انسانی شیر خوار زبان کا اکتساب کیسے

کرتا ہے اور آخر عمر تک اس کی زباندانی میں کیا کیا تبدیلیاں آتی ہیں۔ ابتدا میں بچہ اپنی زبان کے الفاظ سنتا ہے پھر انھیں ابتدائی کتاب میں پڑھتا ہے بعدازاں دوسری زبان کے الفاظ سیکھتا ہے اور بیشتر صورتوں میں انھیں کتاب میں پڑھتا ہے۔ یہ تحصیلی حصہ ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جب زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو بولا یا لکھا جاتا ہے خواہ وہ اپنی زبان ہو یا غیر زبان۔ یہ تخلیقی حصہ ہے جس کے لیے زبان پر زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ عام طور پر چار سے چھ برس کی عمر تک اپنی پہلی زبان پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ بہت کم بچے ایسے ہوتے ہیں جو اس عمر میں بھی بعض آوازوں کو غلط انداز میں بولتے ہیں۔ چار پانچ برس کی عمر کے بعد زبان سیکھنے کے عمل میں اصل کام ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنا ہے۔ لسانی فردیات میں بچے کے زبان سیکھنے کے عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بڑے ہونے پر انسان کی زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ لسانی تغیرات کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

لسانیات کا دوسرے انسانی علوم کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ جن میں تاریخ، فلسفہ، سماجیات، نفسیات، حیاتیات، جغرافیہ اور کمپیوٹر سائنس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں علوم کی رعایت سے ہم لسانیات کو مختلف شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں جیسے سماجی لسانیات، نفسیاتی لسانیات، کمپیوٹر لسانیات وغیرہ۔ دنیا کا کوئی علم محض اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔ ایک علم کا کسی دوسرے علم سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے مثلاً جب ہم لسانیات کو زبان کے سائنٹفک مطالعے کا نام دیتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زبان جو کسی سماج کے اظہار کا واحد صوتی علامتی ذریعہ ہے وہ اس سماج سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح لسانیات کا سماج سے براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ سماج کی رعایت سے جب ہم زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ سماجی لسانیات کا موضوع بن

جاتا ہے۔ زبان کے مطالعے میں بولنے والوں کی نفسیات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بڑوں کے مقابلے میں بچوں کے لسانی رویے الگ ہوتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی نفسیات میں فرق کے باعث دونوں کے لسانی رویے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی شخص کو نئی زبان سکھاتے وقت جو مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں وہ اس کے نفسیاتی مسائل کا نتیجہ ہوں گے۔ اس طرح نفسیات کے تعلق سے زبان کا مطالعہ نفسیاتی لسانیات کا موضوع بن جاتا ہے۔

ایک زبان مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ علاقے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جہاں دوسری زبانوں کے بولنے والے بھی رہتے ہوں۔ جب زبان کے مطالعے میں اعداد و شمار کی کارفرمائی نظر آئے تو ایسا مطالعہ شماریاتی لسانیات کہلائے گا۔ زبان سے متعلق مسائل کی نوعیت کے پیش نظر لسانیات کو مزید حصوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلاً تاریخی لسانیات، تقابلی لسانیات، اطلاقی لسانیات، توضیحی لسانیات وغیرہ۔

تاریخی لسانیات میں زبان کے ماخذ، ارتقا اور تشکیل یا بازیافت سے بحث ہوتی ہے اس میں الفاظ کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جاتا ہے اور ان گروہوں کے مطالعے کے ذریعے زبان کے اصل وطن کی شناخت اور اس کی خصوصیات معلوم کی جاتی ہیں۔ جس خاندان کے اصل روپ کی تحقیق کرنی ہو اس کی موجودہ زبانوں کے علاوہ پرانی شاخوں کے الفاظ بھی سامنے رکھے جاتے ہیں۔ مفرد الفاظ کے علاوہ قدیم زبانوں کے پھیلاؤ، علاقے اور وجود سے بہت سے تاریخی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ تہذیبی اور مذہبی حالات کو دریافت کرتے وقت ان سے متعلق علوم پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔

نسلی لسانیات میں بشریاتی نقطۂ نظر سے لسانیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس

مطالعے میں کسی نسل کی زبان کو اس کی ثقافت کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔ نسلی لسانیات ماہرینِ لسانیات کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ ان کی تہذیب میں جن اشیا کی اہمیت ہوتی ہے ان ہی کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ کسی معاشرے میں رشتوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کے لیے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب کوئی معاشرہ جدید تمدن اپناتا ہے تو اس کی زبان میں بھی اسی قسم کے الفاظ در آتے ہیں۔ مستعار الفاظ پر غور سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس لسانی گروہ نے کس دوسرے لسانی گروہ سے کیا لیا اور اسے کیا دیا۔ بعض لسانی خاندان وسیع علاقے پر پھیلے ہوتے ہیں جبکہ بعض بہت مختصر علاقے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ایسی زبانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو کسی خاندان سے وابستہ نہیں تھیں۔ جس کی وجہ سے زبانوں کی تعداد کافی زیادہ تھی لیکن انسانی نسلوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی نسل کی مختلف اقوام مختلف زبانیں بولتی تھیں۔ قدیم دور میں زبانوں کی تعداد زیادہ تھی بعد ازاں مماثلت کے سبب ان کے اختلافات کم ہو گئے اور بڑے بڑے علاقوں میں مختلف خاندانوں کی زبانوں میں یکساں صوتی خصوصیات نظر آنے لگیں۔

سماجی لسانیات میں زبان کا مطالعہ سماجی سیاق میں کیا جاتا ہے۔ اسے زبان کی سماجیات بھی کہا جاتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک نسلی لسانیات اور سماجی لسانیات میں ویسا ہی تعلق ہے جو ثقافتی بشریات اور سماجیات میں ہوتا ہے۔ ثقافتی بشریات میں معاشروں کی تہذیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور سماجیات میں عصری سماج کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ سماج میں جتنی وسعت ہوگی سماجی لسانیات کے موضوع اتنے ہی متنوع ہوں گے۔ سماجی لسانیات کے مطالعے کا ایک دلچسپ موضوع لسانی آداب ہے۔ اس

میں خطاب کے طریقے بہت اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ یعنی ہم کسے پہلے نام سے پکارتے ہیں اور کسے آخری نام سے۔ کسی نام سے پہلے یا بعد میں تعظیمی لفظ کیسے لگاتے ہیں۔ اُردو میں لسانی تکلفات کی بھرمار سماجی اثرات کے تحت ہے۔ حضور، سرکار، جہاں پناہ، دولت خانہ، غریب خانہ، سماعت فرمائیے، نوش کیجیے، ملاحظہ کیجیے وغیرہ۔

اعدادی لسانیات میں لسانیات پر اعداد و شمار کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت زبان کے مختلف عناصر مثلاً اصوات، فونیم، مارفیم، لفظ اور معنی کا شمار کیا جاتا ہے۔ لسانیات کے لیے اعدادیات سے فائدے اٹھانے کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر میں کی گئی مثلاً پنجاب یونیورسٹی لاہور میں سکول جانے والے بچوں کے مقالوں میں ۶۸ ہزار الفاظ شمار کیے گئے اور ان میں زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ کی تعداد ۲۳۶۸ بتائی گئی۔ اسی طرح ایک مطالعے میں اُردو شماری میں پانچ لاکھ الفاظ لے کر ان میں سے ۱۱ ہزار ایسے الفاظ کی فہرست بنائی گئی جو زیادہ استعمال ہوئے۔ اعدادیات کی بنیاد پر ہی یہ طے کیا جاتا ہے کہ کوئی زبان کس حد تک پھیلی ہوئی ہے۔ کثیر لسانی افراد کے ذخیرۂ الفاظ کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں کس زبان پر کس حد تک عبور ہے۔ اسی طرح بچوں کی درسی کتب کی تیاری میں سب سے پہلے کثیر الاستعمال الفاظ لیے جاتے ہیں اور بعد میں ان سے کم استعمال ہونے والے۔ ایک مصنف کے اسلوب کے لسانیاتی جائزے میں آوازوں، محاوروں اور ضرب الامثال تک کے تمام عناصر کا شمار کیا جاتا ہے اور انھیں کی بنیاد پر اس کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات متعین ہوتی ہیں۔

تقابلی لسانیات میں دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے باہمی رشتوں کی نوعیتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تقابلی لسانیات میں دو زبانوں کی ساخت کے درمیان پائے

جانے والے فرق کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اطلاقی لسانیات میں زبان سیکھنے یا سکھانے کے طریقوں اور اسلوب کے مطالعے میں لسانیات سے مدد لے کر ان پر اس علم کے اصولوں اور نظریوں کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ لسانیات کی اہم شاخوں میں ایک توضیحی لسانیات ہے۔ توضیحی لسانیات میں زبان کی ساخت سے بحث ہوتی ہے جس کی نوعیت خالص توضیحی اور تجزیاتی ہوتی ہے۔ اس طرح ہم زبان کی ساخت کے تمام پیچ و خم کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین کے بقول:

"تاریخی لسانیات کے تحت ہم کسی زبان کا ارتقا بیان کرنے کے لیے اس کی قدیم تر منزل کا تجزیاتی بیان پیش کرنے کے لیے مجبور ہیں یعنی یہ کہ ماضی میں اس کی اصوات، اس کی قواعد، اس کے چسپیے (Affixes) وغیرہ کیا تھے۔ اس طرح تاریخی لسانیات تجزیاتی لسانیات سے استفادہ کرتی ہے اور جہاں تک تقابلی لسانیات کا سوال ہے وہاں بھی تجزیاتی لسانیات سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔ دو مختلف زبانوں کی اصوات یا ان کی تعریف کے قواعد کا مطالعہ تبھی تو کیا جا سکتا ہے جب ہم ان میں سے ہر ایک کی بناوٹ سے واقف ہوں۔ اس طرح تقابلی لسانیات بھی تجزیاتی لسانیات کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔"(۵)

زبانوں کے قواعد بھی اس علم کے نظریوں، اصولوں، قاعدوں اور تصورات کی مدد سے ترتیب پاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ زبان مختلف آوازوں، لفظوں اور جملوں کے ایک باقاعدہ نظام پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک زبان سے دوسری زبان میں بدلتا رہتا ہے۔

آوازیں ہمارے اعضائے صوت کے مختلف انداز میں عمل پیرا ہونے سے تلفظ ہوتی ہیں اور آوازوں کے سلسلوں سے الفاظ تشکیل پاتے ہیں جبکہ لفظوں کی مخصوص ترتیب سے فقرے اور جملے بنتے ہیں۔ آوازوں سے لے کر جملوں تک ہر مقام پر ہمارا عمل اختیاری ہوتا ہے جس سے معانی و مفاہیم کا تعین کیا جاتا ہے۔ زبان میں تلفظ کی جانے والی آوازیں عام صوتیات کا موضوع ہیں۔ اعضائے صوت کسے کہتے ہیں؟ وہ آوازوں کے تلفظ کے وقت کس طرح عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ایک کے مقابلے میں دوسری آواز کو کس طرح پہچانا جاتا ہے۔ انھیں کن بنیادوں پر ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ کس بنیاد پر آوازوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ تکلمی صوتیات ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

آواز کی لہروں کا تجزیہ سمعی فونیات کا موضوع ہے جو بولنے والوں کے ہونٹوں سے سننے والوں کے کانوں تک پھیلی ہوتی ہیں۔ فونیات کی ایک قسم گوشی فونیات Auditory Phonetics ہے جو آوازوں کو سنتے وقت کان کے اندرونی نظام سے بحث کرتی ہے اور انھیں پہچاننے کے لیے کان اور دماغ کے تعلق کا جائزہ لیتی ہے۔ آوازوں کے سائنٹفک مطالعے کے ضمن میں تکلمی صوتیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ وہ علم ہے جو کسی آلے کی مدد کے بغیر آوازوں کی ادائیگی، ان کی تقسیم اور درجہ بندی اور توضیح و تجزیہ پیش کرتا ہے۔ تکلمی صوتیات میں آوازوں کو تلفظ کرتے وقت اعضائے صوت کے مختلف انداز میں عمل پیرا ہونے سے بحث کی جاتی ہے جو اعضائے صوت مختلف انداز میں عمل پیرا ہو کر آوازوں کو تلفظ کرتے ہیں ان میں ہونٹ، دانت، تالو، زبان، حلق، ناک اور منہ کی نالیاں قابلِ ذکر ہیں۔

تکلمی آوازوں کی ادائیگی میں ہونٹ مختلف طرح سے عمل کرتے ہیں۔ باہم

مل کر (جیسے ب، پ، بھ، پھ، م وغیرہ کی آوازیں) دائرے کی شکل میں (جیسے ای، اے، اَے، او وغیرہ) نچلے ہونٹ کے اوپری دانتوں کے ربط میں آکر (جیسے ف، و وغیرہ)۔ زبان سب سے زیادہ عمل کرنے والا صوتی عضو ہے۔ صوت کے اعتبار سے اس کے کئی حصے کیے جاسکتے ہیں جیسے نوک، اگلا، درمیانی، پچھلا، جڑ کا حصہ۔ جب زبان کا اگلا حصہ دانتوں کے پچھلے حصے سے مل کر آوازیں پیدا کرے تو وہ دندانی آوازیں Dental Sounds کہلائیں گی جیسے ت، تھ، د، دھ وغیرہ۔ زبان کا اگلا حصہ اوپری مسوڑھے سے مل کر ل، ن وغیرہ کی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ زبان کا درمیانی حصہ پیچھے کی طرف مڑ کر اوپری مسوڑھے کے ساتھ ٹھ، ٹ، ڈ، ڈھ، ڑ وغیرہ کی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ زبان کا اگلا حصہ سخت تالو سے مل کر چ، چھ، ج، جھ، س، ز وغیرہ کی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ جب زبان کا پچھلا حصہ تالو سے ملتا ہے تو ک، کھ، گ، گھ، خ، غ وغیرہ کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

لسانیاتی مطالعے کی اہم شاخیں

تجزیاتی لسانیات کی نمایاں شاخیں درج ذیل ہیں:

صوتیات: Phonetics

اس میں عموماً ان آوازوں اور ان کے تخلیقی عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو نطقِ انسانی سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس مطالعے میں ہر صوت کا صحیح اور مفصّل جائزہ لیا جاتا ہے۔ اعضائے نطق کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) ہونٹ (۲) دانت (۳) نوکِ زبان (۴) زبان کا پھل (۵) وسطِ زبان
(۶) زبان کا پچھلا حصہ (۷) بیخِ زبان (۸) اوپری مسوڑہ (۹) سخت تالو
(۱۰) نرم تالو (۱۱) کوا (۱۲) خلائے بینی (۱۳) حلق (۱۴) کنٹھ کا ڈھکنا

(۱۵) صوتی تار (۱۶) صوتی تاروں کا دہانہ (۱۷) حنجرہ (۱۸) سانس کی نلی
(۱۹) کھانے کی نلی (۲۰) ٹیٹوا

اعضائے نطق کو چار بڑے خلاؤں میں بانٹا جاتا ہے جن میں خلائے دہن، خلائے بینی، خلائے حلق اور خلائے حنجرہ شامل ہیں۔ دہن میں ہونٹوں اور دانتوں کے علاوہ اوپری مسوڑا، سخت تالو، نرم تالو اور کوا کے حصے شامل ہیں۔ زبان کے چار حصوں میں نوکِ زبان، وسطِ زبان (زبان کا پھل)، عقبِ زبان (زبان کا پچھلا حصہ) اور بیخِ زبان (زبان کی جڑ) شامل ہیں۔ خلائے بینی سے مراد وہ راستہ ہے جو حلق سے ناک کو جاتا ہے۔ حلق سے نیچے پیچھے کی جانب کھانے کی نلی اور آگے کی جانب سانس کی نلی ہے۔ کنٹھ کا ڈھکنا سانس کی نلی کے منہ کے اوپر اور بیخِ زبان کا سب سے نچلا حصہ ہے جو ایک قسم کی چھوٹی جیبھ ہے۔ جب ہم کچھ کھاتے پیتے ہیں تو یہ ڈھکنا سانس کی نلی کے اوپر آکے اسے تیزی سے ڈھک لیتا ہے جس کے سبب کھانا یا پانی سانس کی نلی میں داخل نہیں ہوتا۔ اگر اس عمل میں کوتاہی ہو جائے تو کھانے یا پانی کی تھوڑی سی مقدار سانس کی نلی میں چلے جانے کے سبب اچھو لگ جاتا ہے۔ یہ علاقہ اعضائے حلق کہلاتا ہے۔ سانس کی نلی کے اوپری حصے میں عضلات کا ڈبہ حنجرہ کہلاتا ہے جبکہ اس کا خارجی حصہ ٹیٹوا کہلاتا ہے۔ حنجرے میں دو صوتی تار ہوتے ہیں جو مردوں میں عموماً پون انچ اور عورتوں میں آدھ انچ لمبے ہوتے ہیں۔ انسانی اعضائے نطق میں پھیپھڑے سے ہوا صوتی تاروں کے درمیان سے نکلتی ہے۔ یہ تار ایک دوسرے کے نزدیک آکے راستے کو مزید تنگ کرتے ہیں جس سے آواز میں زور پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہوا تاروں میں تیز ارتعاش پیدا کرتی ہے اور یہ ارتعاش جتنا تیز ہوتا ہے آواز اتنی ہی زوردار ہوتی ہے۔ صوتی تاروں کے نزدیک آنے سے ارتعاش کے

باعث پیدا ہونے والی آواز کو Voice کہا جاتا ہے۔

اگر صوتی تار ایک طرف بالکل مل جائیں اور دوسری طرف سے کھلے رہیں تو ایسی صورت میں جو آوازیں نکلیں گی انھیں مصیتی Voice less کہا جائے گا۔ اگر اوپر کا تین چوتھائی حصہ ملا ہوا جبکہ نیچے کا ایک چوتھائی حصہ کھلا ہو اور ان کے بیچ میں سے ہوا اس طرح سے گزرے کے کوئی ارتعاش پیدا نہ ہو تو جو آواز نکلے گی وہ سرگوشی کہلائے گی۔ پ، ت، چ، ٹ، ک غیر مصیتی مصمتے ہیں جبکہ ب، د، ج، ڈ، گ مصیتی ہیں۔ مصوتے مصیتی ہوتے ہیں۔ مصیتی آواز میں ٹیٹوا آگے کو بڑھتا ہے جبکہ غیر مصیتی میں آگے کو نہیں بڑھتا۔ آوازوں کی ادائیگی کے حوالے سے خلائے حلق یا خلائے دہن میں کچھ اعضائے نطق دوسرے اعضا کی طرف بڑھتے ہیں۔ بڑھنے والے اعضائے نطق تلفیظ کار جبکہ جس سمت یہ حرکت کرتے ہیں وہ نقطۂ تلفیظ کہلاتا ہے۔

مصوتے اور مصمتے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مصوتے کی ادائیگی میں کسی قسم کی روک ٹوک کا عمل دخل نہیں ہوتا جبکہ مصمتے میں اکثر راہ تنگ ہوتی ہے۔ لیکن تمام صورتوں میں یہ تعریف مکمل طور پر لاگو نہیں ہوتی۔ صوتیات کا علم کسی خاص زبان سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس میں تمام زبانوں کی آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مصمتوں اور مصوتوں کے علاوہ تلفیظی صوتیات میں آوازوں کی کرخت یا تناؤ دار اور ملائم یا ڈھیلی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔ کرخت ادائیگی میں عضلات تنے اور کسے ہوتے ہیں مثلاً س، ژ، اِی اور اُو وغیرہ جبکہ الفاظ کی ملائم ادائیگی میں عضلات آرام دہ حالت میں ہوتے ہیں ر، ل وغیرہ۔ انگریزی کی نسبت فرانسیسی اور اطالوی مصوتے کرخت ہوتے ہیں۔

مصوتوں کے تعین میں دو بنیادی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں دیکھا جاتا ہے کہ زبان کا کون سا حصہ اوپر اٹھتا ہے اور زبان کتنی اوپر اٹھتی ہے۔ مصوتے

خفیف،طویل اور طولانی تین اقسام کے ہوتے ہیں۔طویل مصوتوں کی ادائیگی میں
خفیف کی نسبت دوگنا وقت لگتا ہے۔مختصر مصوتے طویل مصوتوں سے کچھ نیچے سے ادا
ہوتے ہیں۔مختصر مصوتے ڈھیلے اور مائم جبکہ عموماً طویل مصوتے کرخت ہوتے ہیں۔
شعر کا وزن یا آہنگ صوت رکن پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ شارٹ ہینڈ کی بنیاد
بھی صوت رکن کے ادراک سے مشروط ہے۔دنیا کی تمام زبانوں میں صوت رکن
ایک اصول کے تحت متعین نہیں کیا جا سکتا۔طویل مصوتے مختصر مصوتوں کی نسبت زیادہ
گونج دار ہوتے ہیں۔زبانوں کے دو قسم کے لہجے ہوتے ہیں۔بَل لہجہ اور سُر لہجہ۔بَل
لہجے میں لفظوں کی تلفیظ مختلف صوت رکنوں پر بَل (زور) کی کمی بیشی سے ہوتی ہے
جبکہ سُر لہجے میں الفاظ کے درمیان سُر کا نشیب و فراز اہم ہوتا ہے اور بَل کی کوئی اہمیت
نہیں ہوتی۔

فونیمیات:Phonology

فونیمیات سے مراد وہ علم ہے جو کسی زبان کے فونیم دریافت اور متعین کرے
اُردو میں فونیمیات کا ترجمہ صوتیہ بھی کیا جاتا ہے لیکن فونیم کو اُردو میں فونیم اور فونیمکس
کو فونیمیات کہنا زیادہ مناسب ہے۔صوتیات میں ہمیں ضروری اور غیر ضروری ہر قسم
کی تفصیلات سے واسطہ پڑتا ہے جبکہ فونیمیات ہمیں ان تفصیلات اور خصوصیات تک
محدود رکھتی ہے جو مفہوم کی ترسیل میں اہم ہوتی ہیں۔کسی زبان کے نظامِ اصوات
میں فونیم سے مراد مماثل آوازوں کا ایسا مجموعہ ہے جو جو اسی قسم کے دوسرے گروہوں
سے مختلف ہو۔فونیم کا تعلق کسی خاص زبان یا بولی سے ہوتا ہے جبکہ صوتیاتی مطالعہ کسی
مخصوص زبان کا بھی ہو سکتا ہے اور کئی زبانوں کا بھی۔فونیم کے ذیل میں نازک سے
نازک فرق کی بنیاد پر جو آوازیں شامل ہوتی ہیں انھیں ہم صوت اور ذیلی صوت کہا

جاتا ہے۔ دو فونیم مختلف الفاظ میں یکساں ماحول میں تو آسکتے ہیں لیکن یکساں ماحول میں ایک فونیم کے دو ہم صوت کبھی نہیں آسکتے۔

لفظوں کا ایسا جوڑا جس میں محض ایک آواز مختلف ہو اور باقی سب یکساں ہوں لیکن ان الفاظ کے معنی میں فرق ہو، یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ مختلف آوازیں دراصل مختلف فونیم ہیں مثلاً بار، پار۔ آب، آپ میں ب اور پ کی علیحدہ فونیمی حیثیت طے شدہ ہے۔ درج ذیل الفاظ دیکھیے:

پال، تال، دال، ڈال، کال، گال، جال، چال، مال، لال، سال، شال، حال، خال وغیرہ۔ یہ تمام مصمتے الگ الگ فونیم ہیں۔

عام طور پر زبانوں کے نظامِ اصوات باقاعدہ ہوتے ہیں۔ صوتیات کا مطالبہ ہے کہ ایک فونیم کے جتنے زیادہ سے زیادہ ہم صوت معلوم ہوسکیں اتنا ہی بہتر ہے۔ فونیم کی تلاش میں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ آوازیں اپنے مقام کے اعتبار سے بھی بدل جاتی ہیں مثلاً ہاتھ، ساتھ کو ہات، سات نہیں بولا جاسکتا لیکن ان کی 'تھ، تھال کی 'تھ'، کے برابر بھی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کم ہے۔ ایسے خفیف صوتی اختلافات کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ آوازیں علیحدہ فونیم ہیں یا ایک فونیم کے دو ہم صوت۔ ماقبل اور مابعد آوازوں کے زیرِ اثر بھی آوازیں اپنے مخرج سے دور ہوسکتی ہیں مثلاً کی، کا، کو میں ک کا مخرج ایک سا نہیں ہے۔ 'کی' کا 'ک' آگے ہے، 'کا' کا درمیان میں اور 'کو' کا پیچھے۔ آوازوں کے ان اختلافات میں مخرج کی درست تفہیم کرتے ہوئے انھیں ہم صوت تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جداگانہ فونیم نہیں کہا جاسکتا۔ فونیم کا تصور تلفیظی صوتیات پر قائم ہے۔ فونیم میں آوازوں کی غیر اہم خصوصیات کی بجائے صرف امتیازی خصوصیات پیشِ نظر رہتی ہیں۔

مارفیمیات یا صرف: Marphology

مارفیم کو چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائی کہا جاتا ہے۔ یعنی مارفیم ایسی چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے جس میں ہیئت اور موضوع کے درمیان رشتہ ہوتا ہے۔ مارفیم کے بامعنی ہونے کے معنی لغت کے معنی نہیں ہوتے بلکہ ہیئت اور مواد کے درمیان کسی نہ کسی تعلق کا ہونا کافی ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایک مارفیم کی کئی شکلیں ہوتی ہیں مثلاً تم کھا کر گئے، تم کھا کے گئے۔ نو بجنا چاہتے ہیں، نو بجا چاہتے ہیں۔ ان میں کر اور کے، بجنا اور بجا کے نا اور آ، ہم معنی ہیں اور یہ ایک ہی مارفیم کی شکلیں ہیں۔ انھیں ایلو مارف کہا جاتا ہے۔ مارفیم کی تقسیم ان کی داخلی ساخت اور وقوع کی بنا پر کی جاتی ہے۔ داخلی ساخت میں تین بنیادوں پر غور کیا جاتا ہے جن میں مارفیم کے فونیموں کی نوعیت، مارفیم کی شکل اور مارفیم کے اجزا کا باہمی رشتہ شامل ہیں۔

مارفیمیات مارفیم اور لفظ کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً سابقے جو اصل کی ابتدا میں شامل کیے جاتے ہیں مثلاً انجان، ناگوار، نافرمان وغیرہ میں ان اور نا۔ لاحقے کی صورت میں جو اصل کے آخر میں آتے ہیں مثلاً آنا، جانا میں 'نا'۔ وسطیے کی صورت میں جو مادے یا اصل کے بیچ میں شامل کیے جاتے ہیں مثلاً علم (ع ل م) سے عالم یا علیم۔ مادے یا جزو کو دہرانے سے بھی دوسرا لفظ بنایا جاتا ہے مثلاً سائیں سائیں، چٹاخ چٹاخ وغیرہ۔ اُردو میں تکراری مارفیم کا تعین دہرائے جانے والے جزو کے بامعنی یا بے معنی ہونے پر ہوتا ہے مثلاً بھاگم بھاگ اور مالامال میں بھاگ اور مال میں ایک ہی مارفیم کی تکرار سے مرکب شکل کا وجود ممکن ہوا ہے۔ اسی طرح گڑگڑانا، گڑگڑاہٹ، ڈبڈبانا اور گدگدانا میں گڑ، ڈب اور گد کے کوئی معنی نہیں ہیں اس لیے ان کا مارفیم گڑگڑ، ڈبڈب اور گدگد ہے۔ انھیں تکراری مارفیم کہا جائے گا۔ لفظ

کی ساخت کے بیان کے طریقے میں مارفیموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور انھیں ملانے والا قواعدی عمل بیان کیا جاتا ہے۔ قواعدی عمل کو لفظ سازی کی دو بڑی اقسام تصریف اور اشتقاق میں بیان کیا جاتا ہے۔ تصریف کا تعلق اسم، ضمیر، صفت اور فعل سے ہے۔ اسم، ضمیر، صفت اور فعل کے علاوہ باقی اجزائے کلام نحو کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

اسم میں تعداد، جنس اور حالت تصریفی زمرے ہیں۔ حالت کا تعلق مارفیمیات سے ہوتا ہے اور اس کی تشکیل والے چسپیے تصریف سے متعلق ہیں جبکہ ان کی غرض وغایت کا تعلق نحو سے ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے واحد پہلا عدد ہے۔ جمع کا صیغہ بعد میں بنا۔ مختلف زبانوں میں فطری اور قواعدی جنس ہوتی ہے۔ فطری جنس میں مذکر، مونث اور نا متعلق Neuter شامل ہیں جبکہ قواعدی جنس Animism سے متعلق ہے۔ بعض زبانوں میں جنس کی جگہ گروہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ضمیر میں شخص، تعدا، حالت اور جنس شامل ہے۔ بیشتر زبانوں میں متکلم ضمیر میں شمولی اور خارجی دونوں صیغے پائے جاتے ہیں مثلاً بعض صورتوں میں 'ہم' میں 'میں اور تم' دونوں صیغے ہوتے ہیں لیکن بعض صورتوں میں 'ہم' میں صرف متکلم شامل ہوتا ہے مخاطب نہیں۔ فعل میں تعداد، جنس، زمانہ، طور Voice، صورت Mood شامل ہیں۔ ایک بنیادی روپ سے جو تصریفی لفظ تشکیل پاتے ہیں ان کے قواعدی عمل کو تصریف کہتے ہیں۔ ان سے ہٹ کر کسی اور قسم کے جو الفاظ بنائے جاتے ہیں ان کا قواعدی عمل اشتقاقی کہلاتا ہے۔

تصریفی روپ بروں مرکزی جبکہ اشتقاقی روپ دروں مرکزی ہوتے ہیں۔ اشتقاقی روپ کی جگہ سادہ روپ آسکتا ہے مثلاً میں تمھاری شرافت کا قائل ہوگیا، میں تمھاری دیانت کا قائل ہوگیا۔ اس میں شرافت کی جگہ دیانت آسکتا ہے۔ تصریفی روپ کی جگہ غیر تصریفی روپ نہیں آسکتا۔ مارفیمیات میں مارفیم، چسپیوں اور لفظ سے

بھی بحث کی جاتی ہے اور مرکب الفاظ کی ساخت کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ مرکب مارفیمیات اور نحو کی سرحد ہے۔ گرے نے مرکب کو صحیح اور غیر صحیح دو صورتوں میں تقسیم کیا ہے۔ صحیح مرکب کے اجزا میں صرف آخری جزو کی تصریف ہوتی ہے جبکہ غیر صحیح مرکب میں کم از کم دو اجزا پر تصریفی عمل ہوتا ہے۔ صحیح مرکب تاریخی اعتبار سے زیادہ پرانے ہیں جبکہ غیر صحیح مرکب نسبتاً کم پرانے ہیں۔ سادہ لفظ ایک مارفیم پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً گھر، میز، باہر وغیرہ جبکہ پیچیدہ لفظ میں ایک سے زیادہ مارفیم ہوتے ہیں مثلاً لڑکا، کھڑا (لڑک، آ۔ کھڑ، آ)۔ ادھ موا (آدھا، موا)۔ پت جھڑ (پتہ۔ جھڑ)۔ پھلجھڑی (پھول۔ جھڑی) مرکب ہیں۔ تصریفی صورتوں کی نسبت اشتقاقی صورتوں میں زیادہ تنوع ہوتا ہے۔

نحو: Syntax

تصریف اور اشتقاق کے عمل سے بننے والی ترکیبوں کو مزید بڑی بندشوں میں ترتیب دینے کے اصول کو نحو کہا جاتا ہے۔ نحو ان طریقوں کے مطالعہ کا نام ہے جن میں الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ مارفیمیات کو ان طریقوں کا مطالعہ کہا جاتا ہے جن سے لفظ بنتے ہیں۔ مارفیمیات میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے جبکہ نحو لفظ سے بڑی ترکیبوں میں لفظوں کی ترتیب کا مطالعہ کرتی ہے۔ بعض مقامات پر یہ دونوں شاخیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ مختلف گروہوں کے ارکان کو ملا کر جس طرح ملا کر کوئی ترکیب تیار کی جاتی ہے اسے ترکیبی سانچا کہا جاتا ہے۔ لفظ میں مارفیمی چسپیوں کی ترتیب طے ہوتی ہے اسی طرح فقروں اور جملوں میں بھی لفظ کا محل اور ترتیب اہم ہے۔ ترتیب مختلف طرح سے ہوتی ہے لیکن وہ اصول اور ضابطے کے تحت ہوتی ہے۔ لسانیات میں جملے سے مراد ایسا قواعدی روپ ہے جو کسی بڑی قواعدی

ترکیب میں مشمول نہیں ہوتا۔ بعض صورتوں میں جملے میں مشمول اور شمول کار کا فرق نہیں ہوتا بلکہ پورا جملہ ایک مارفیم ہوتا ہے مثلاً:

احمد: حسن

حسن: ہاں

'حسن، اور 'ہاں، پورے جملے ہیں اور ایک مارفیم ہیں۔ قواعد کی رُو سے یہ جملہ نہیں لیکن لسانیات کی رو سے جملہ ہے۔ لسانیات میں جملے میں فعل کی موجودگی ضروری نہیں ہے مثلاً:

احمد!

حسن!

وہ گیا

کب؟

وہ گیا

کس کے ساتھ؟

تم چلو گے؟

ہاں

ان میں احمد، حسن، کب، ہاں اور کس کے ساتھ لسانی اعتبار سے جملے ہیں کیونکہ ان میں بات مکمل طور پر بیان ہو رہی ہے۔ جس ترکیب میں قریبی مشمولوں میں ایک یا ایک سے زیادہ شمول کار کو اس کی جگہ لایا جا سکے وہ ترکیب دروں مرکزی کہلاتی ہے مثلاً ذہین لڑکا میں 'لڑکا' کا روپ گروہ 'ذہین لڑکا' والا ہی ہے۔ اگر مشمولوں میں سے کوئی بھی شمول کار کی جگہ نہیں رکھا جا سکتا یعنی روپ گروہ میں نہیں ہے تو اسے

بروں مرکزی ترکیب کہیں گے۔ نحوی تصریفی انسلاک میں جملے کے کسی مخصوص لفظ کو کسی دوسرے لفظ کے موافق ہونا چاہیے۔ اسے توافق کہتے ہیں۔ یہ صفتی اور فعلی دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ صفت کی جنس یا تعداد اور بعض صورتوں میں دونوں ہی موصوف کے مطابق ہوتی ہیں مثلاً ذہین لڑکا، ذہین لڑکے، ذہین لڑکیاں۔ یہ دروں مرکزی فقروں میں زیادہ ملتے ہیں۔ اگر جنس یا تعداد یا دونوں فاعل یا مفعول کے مطابق ہوں تو اسے فعلی کہا جائے گا۔ دکنی میں فعل فاعل کے مطابق تھا لیکن معیاری اُردو میں فاعل کے بعد 'نے' استعمال ہونے کی صورت میں فعل مفعول کے مطابق ہوتا ہے۔

معیاری اُردو	دکنی
لڑکے نے گوشت کھایا	لڑکا گوشت کھایا
لڑکی نے گوشت کھایا	لڑکی گوشت کھایا
لڑکوں نے گوشت کھایا	لڑکے گوشت کھائے
لڑکیوں نے گوشت کھایا	لڑکیاں گوشت کھائیں
لڑکے نے چاول کھائے	لڑکا چاول کھایا
لڑکی نے چاول کھائے	لڑکی چاول کھائے
لڑکوں نے چاول کھائے	لڑکے چاول کھائے
لڑکیوں نے چاول کھائے	لڑکیاں چاول کھائیں

تجزیاتی لسانیات کا نحو ساختی نقطۂ نظر سے بھی جملے کے مختلف اجزا کے رشتوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ روایتی قواعد سے ناآسودگی نے تجزیاتی لسانیات کو فروغ دیا ابتدا میں اس پر صوتیات پر بہت زور دیا گیا بعدازاں اس میں فونیم اور مارفیم کے نظریات بھی شامل ہو گئے۔ نحو میں قریبی مشمولی تجزیے کو شامل کیا گیا۔ نحو ان اصول و

قواعد کا نام ہے جس سے مختلف زبانوں میں جملے بنائے جاتے ہیں جبکہ قواعد وہ ترتیب ہے جس کے تحت کسی زبان کے تمام صحیح قواعدی جملے بنائے جاتے ہیں۔ قواعد عام طور سے صرف ونحو کو کہا جاتا ہے اس لیے ان دونوں کے مطالعے کے آخر میں قواعد کے مختلف مفاہیم اور اقسام پر غور کیا جاتا ہے۔ قواعد جملے کی ساخت تک محدود ہے۔ اگر دو زبانوں کے جملہ تخلیق کرنے الے قواعد کو یک جا کر کے لکھا جائے تو اسے تبادلی قواعد کا نام دیا جائے گا۔ تشکیلی قواعد میں ایک جملے سے دوسرے جملے ماخوذ کرنے کے قواعد بیان کیے جاتے ہیں اور ایک زبان کے جملوں کے مکمل بنیادی نمونوں اور ان سے ماخوذ کیے گئے تمام نمونوں کے تشکیلی قواعد شامل ہیں۔

معنیات:Semantics

معنیات لسانیاتی مطالعے کی اہم شاخ ہے۔ معنیات کے نقطۂ نظر سے مسلسل کلام کو مارفیم کی بجائے لفظ کی اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ معنیات میں لفظ کو اکائی کی حیثیت حاصل ہے۔ لفظ کے مطالعے کے علم کو علم اللغات یا لغاتیات بھی کہا جاتا ہے۔ لغاتیات کے دو حصے ہیں۔ لفظ کی ساخت کا تجزیہ (لغاتی مارفیمیات) اور لفظ کے معنی کا بیان (لغاتی معنیات)۔ یعنی معنیات کا لغاتیات سے گہرا تعلق ہے۔ عام طور پر معنیات سے مراد لغاتی معنیات لیا جاتا ہے۔ نحوی معنیات میں جملے کے اجزا، الفاظ کی ترتیب، تبدیلی کی صورت، حالت، مطابقت اور متابعت کے معنوی عمل کا مطالعہ شامل ہے۔ خاص لفظ خاص معنی کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں اسم اور فعل شامل ہیں جبکہ معاون یا امدادی لفظ میں حروف جار، شرط، امدادی افعال اور ضمیر ہوتے ہیں۔

خاص الفاظ لغاتی معنیات سے متعلق ہیں جبکہ دیگر الفاظ نحوی معنیات سے۔ معنیات میں زیادہ تر لغاتی معنی کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ جس کے لیے لفظ

اکائی ہے۔ بائبل میں ہے:

In the beginning there was the word, and the word was with god and the word was god.

گفتگو کے علاوہ تحریر کے ذریعے ہمیں لفظوں کی آزاد اور جدا حیثیت کا شعور ہوتا ہے۔ لفظ کا سیاق لفظ کے معنی کے ذریعے وسیع ہوتا ہے یعنی معنی سیاقوں کے مجموعے کے مترادف نہیں ہے۔ لسانی روپ کا معنی وہ صورت حال ہے جس میں قائل اسے بولتا ہے اور وہ تاثر بھی ہے جو سامع میں پیدا ہوتا ہے۔ معنی کی تعریف طبعی اور نفسیاتی دونوں پہلوؤں سے کی جاسکتی ہے۔ طبعی پہلو کی نمائندگی صوت، علامت یا نام سے ہوتی ہے جبکہ نفسیاتی پہلو کی معنی یا مفہوم سے۔ اسے صوت و معنی یا نطق و تصور کے دو رخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ صوتی علامتوں کے ذریعے جذبے کا بیان صوت و معنی کو ایک وسیع تر تناظر میں پیش کرتا ہے۔ بات کرنے والا لاشعوری طور پر کسی تصور کے لیے اپنے ماحول سے ایسا مجموعۂ اصوات سیکھتا ہے جو صدیوں سے رائج ہے اس لیے صوت و معنی کا تعلق ایک حد تک فطری ہے۔ زبان میں بیشتر الفاظ (صوتی علامات) معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کچھ من مانے بھی ہیں۔ معنی کے تین عوامل بیان کیے جاتے ہیں جو مرکزی، اطلاقی اور جذباتی پر مشتمل ہیں۔ مفہوم کا جذباتی پہلو نثر سے زیادہ شاعری میں نظر آتا ہے۔ عملی معنی کے بیان کے تین طریقے ہیں۔ پہلے طریقے میں کسی شے کی طرف اشارہ کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اسے براہِ راست طریقہ کہا جاتا ہے۔ اجنبی زبان بولنے والوں کے علاقے میں جا کر الفاظ کے معنی سیکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ دوسرا اہم طریقہ ترجمے کا ہے۔ دو زبانی لغات میں یہی طریقہ استعمال ہوتا ہے۔ تیسرا طریقہ تشریح و توضیح سے متعلق ہے یعنی اسی زبان میں تفصیل بیان کر دی جائے۔

عصریاتی لسانیات میں کثیر معنویت کو بھی اہمیت حاصل ہے یعنی پرانے معنی

بھی زندہ رہیں اور نئے معنی کا اضافہ بھی ہوتا جائے۔ بیانی معنیات میں معنی کی تعریف، صوتی نام اور مفہوم کی خصوصیات اور نام اور مفہوم کے تعلق کی مختلف صورتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ معنیات میں بیانی اور تاریخی مطالعے کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نام اور مفہوم کے تعلق کی مختلف صورتیں تاریخی ارتقا ہی کی بدولت ہیں۔ معنیات کے ماہرین اس کی ترقی کے لیے مختلف کوششیں کرتے رہتے ہیں اس کی ایک صورت عام معنیات کی کوشش ہے جو کسی مخصوص زبان سے متعلق تو نہیں ہے البتہ نطقِ انسانی سے متعلق قرار دی جا سکتی ہے۔

تجزیاتی لسانیات میں فونیمیات، صرف ونحو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ صوتیات اور معنیات کو نسبتاً کم اہمیت دی جاتی ہے۔ تجزیاتی لسانیات کے علم برداروں کے نزدیک لسانیات کو زبان کی ہیئت سے غرض ہے معنی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ حالانکہ فونیمیات اور صوتیات کے درمیان حد بندی ناممکن ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں رہ سکتیں۔ جدید لسانیات میں صوتیات کے مطالعے کو خاصی اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ تاریخی و تقابلی مطالعات میں بھی صوتیات کے بغیر تجزیہ نامکمل رہتا ہے۔

پروفیسر گیان چند جین کی رائے میں:

> "ادب سے لسانیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لسانیات سے قدیم ادب کو اور دوسری زبانوں سے مستعار لفظوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لسانیات کے لیے ادب مسالہ فراہم کرتا ہے۔ زبان کا تاریخی مطالعہ عہد بہ عہد کے ادبی نمونوں ہی کے سہارے ہو سکتا ہے۔

تاریخی لسانیات تاریخ سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایک قوم پر دوسری قوم

کی حکومت، تجارتی تعلقات وغیرہ فریقین کی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی لسانیات بھی تاریخ کو شمع دکھاتی ہے۔ یورپ اور ویلز کے جپسیوں کی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی افراط اس بات کی شاہد ہے کہ یہ لوگ عہدِ قدیم میں ہندوستان سے جا کر مغرب میں بود و باش کرنے لگے۔''(۹)

اسی طرح آثارِ قدیمہ زبانوں کے نمونوں کی حفاظت کرتا ہے اور لسانیات کے ماہرین کتبوں اور تحریروں کو پڑھ کر اپنے نتائج وضع کرتے ہیں۔ یعنی ایک مرحلے پر آثارِ قدیمہ اور لسانیات کے علوم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ سماجی لسانیات میں یہ امر پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی بلند اور پست کیوں ہو جاتے ہیں۔ لسانی عتیقیات کو لسانیات کا ایک اہم شعبہ گردانا جانے لگا ہے اس میں زبانوں کی عمر کے تعین کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی لگایا جاتا ہے کہ ایک صدی کے دوران میں ایک زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں کس حد تک تبدیلی واقع ہوئی ہے ۔لسانیات کا اہم موضوع زبان کا آغاز اور ارتقا ہے جس کے بغیر ادب کا مطالعہ ادھورا ہے۔ قدیم ادب کی فرہنگوں کی تفہیم کے سلسلے میں لسانیات ہی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ادبی مخطوطات کے زمانی تعین کا معاملہ بھی لسانیات کا مرہونِ منت ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر گیان چند جین کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''خدا بخش لائبریری بانکی پور میں کیمیائے سعادت کا جو مخطوطہ ہے اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مصنف امام غزالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کا مطالعہ کیا تو اس میں دال ذال کا وہ فرق نہ پایا جو قدیم کتابت میں ہونا چاہیے۔ اس کی بنا پر انھوں نے طے کیا کہ یہ مخطوطہ غلط طور پر ان سے منسوب ہے۔ اسی طرح

فارسی خط کی کچھ اور خصوصیات ہیں مثلاً ساتویں صدی ہجری تک
کاف بیانیہ 'کہ' کو 'کی' لکھا جاتا تھا۔ بارہویں صدی ہجری تک گ کو
ک ہی لکھا جاتا تھا۔ اُردو میں انیسویں صدی کی ابتدا تک ٹ، ڈ، ڑ
کے بالائی ط کے بجائے چار نقطوں کا استعمال ہوتا تھا۔ جن مخطوطوں
میں ان موقعوں پر ط لکھا ہوا ہے وہ انیسویں صدی عیسی سے قدیم تر
نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح کسی مخطوطے میں ہائے مخلوط کا دوچشمی ھ
سے لکھا ہونا اس کے نئے پن پر دلالت کرتا ہے۔ زبان اور طرزِ تحریر
کے ارتقا سے یہ واقفیت تحقیق میں بہت سی لغزشوں سے محفوظ رکھتی
ہے اور تحریر کا ارتقا مطالعہ لسانیات کا ایک شعبہ ہے۔''(۷)

لسانیاتی تحقیق کے حوالے سے حقیقت پسندی کا دامن چھوڑنا مناسب نہیں۔ اس ضمن میں مشینوں کے استعمال کے حوالے سے زیادہ تخیلاتی منصوبے بنانا بھی درست نہیں ہے۔ سائنس فکشن کی وہ دنیا جہاں روبوٹ انسانوں کے سوالات کے جواب دیتا ہے، ابھی حقیقت سے کافی دور ہے۔ اس حوالے سے گفتگو کے اجزا کو مرتب کرنے کیے لیے تکنیکی سہولیات کا فقدان ہے حتیٰ کہ ہم کمپیوٹر کو بلند آواز میں ہدایات دے کے اس سے کام کروانے کے منصوبے کو بھی مکمل طور پر عملی جامہ نہیں پہنا سکے اس لیے ہمیں لسانی تصورات کو قبل از وقت دوسری چیزوں پر لاگو کرنے کے سلسلے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ اس ضمن میں ڈیوڈ کرسٹل رقم طراز ہیں:

''اصولی طور پر ہمیں ان دعووں پر تنقیدی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو
عام طور پر لوگ لسانیات کا نام لے کر کرتے رہتے ہیں۔ ایسے
غیر متوازن نظریات گمراہ کن ہیں اور وہ اس علم کی عام اندازِ فکر کی
نمائندگی نہیں کرتے مثلاً یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صوت سپیکٹروگراف

میں آوازوں کی جو تصاویر سامنے آتی ہیں وہ ایسی معلومات رکھتی ہیں
جن کے ذریعے اگر ہم تربیت یافتہ ہیں تو بولنے والے کو پہچان سکتے
ہیں۔۔۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ پانچ آدمیوں کے بولے ہوئے
دس جملے سن کر بتایا جا سکتا ہے کہ کون سے جملے ایک ہی آدمی نے
ادا کیے ہیں۔ نظریاتی طور پر تو اس بات میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی،
لیکن ابھی ہمارے پاس بہت کم ایسی تجرباتی شہادتیں ہیں جو یہ بتا
سکیں کہ ایسا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے البتہ ایسی واضح شہادتیں ضرور
موجود ہیں جو ثابت کر سکتی ہیں کہ یہ طریقہ غلط ہے۔''(۸)

صوتیات اور عروض کے مابین گہرا تعلق ہے۔ شعر کا وزن اصوات کا مرہونِ منت ہے۔ مروجہ عروض کو صوتیات کی اصطلاحوں کی مدد سے زیادہ آسان اور سائنٹیفک بنایا جا سکتا ہے کیوں کہ عروض کی تراش خراش میں صوتیات کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ فوج کے شعبۂ صوتیات کے تحت بھی دو اہم کام کیے جاتے ہیں یعنی اپنے لیے ایسے کوڈ تیار کرنا جن تک دشمن کی رسائی نہ ہو سکے اور دوسروں کے کوڈ کی تہہ تک پہنچنا۔ اس طریقے کو مردہ زبانوں کے رسم الخط پڑھنے کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔

تجزیاتی لسانیات کے مطالعے کے بغیر زبان کی ساخت کا اندازہ ممکن نہیں۔ صوتیات کے مطالعے کے بغیر زبان کے مصوتوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا بھی دشوار عمل ہے۔ زبان کے اسرار و رموز کا مطالعہ لسانیات ہے جس کے بارے میں جاننا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے تا کہ ہم جو عرصہ دراز سے زبان استعمال کر رہے ہیں اس کی جزئیات کا علم حاصل کر سکیں اور اس کے خارج کے ساتھ ساتھ اس کے داخل تک بھی اپنی رسائی کو ممکن بنا سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۶

۲۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱

۳۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے؟ ڈاکٹر نصیر احمد خان (مترجم)، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸

۴۔ پروفیسر گیان چند جین، عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱

۵۔ پروفیسر گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۲۵

۶۔ پروفیسر گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۳۱

۷۔ پروفیسر گیان چند جین، عام لسانیات، ص ۳۵

۸۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے؟ ڈاکٹر نصیر احمد خان (مترجم)، ص ۹۵

ذخیرۂ الفاظ کی اہمیت اور مسائل

انسان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مختلف وسیلوں سے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتا ہے۔ انسانی باقیات ماضی، حال اور مستقبل میں تعلق قائم کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی تاریخ مرتب کرنے میں بھی ممدومعاون ثابت ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی کے ارتقائی سفر میں اس کا پچھلا سرا آہستہ آہستہ غیر واضح ہو جاتا ہے۔ انسانی تعمیرات کی عمر زیادہ طویل نہیں ہوتی اور وہ موسم کے سرد و گرم کو برداشت کرتے کرتے اپنا وجود کھو دیتی ہیں خصوصاً نم اور مرطوب آب و ہوا والے علاقوں میں یہ عمل زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ البتہ گرم ریگستانوں اور سرد برفیلے علاقوں میں تعمیرات کے نشانات زیادہ دیر تک باقی رہتے ہیں اور تاریخ مرتب کرنے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان تعمیرات سے حاصل کردہ معلومات جزوی اور محدود ہوتی ہیں اور ان کی مدد سے سماجی اور ثقافتی زندگی کی مکمل تصویر کشی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس رسوم و روایات تک رسائی کے ذریعے زندگی کی زیادہ بہتر عکاسی ممکن ہے۔

قدیم ادوار کی سماجی زندگی کے علم کے حصول کا وسیلہ زبان کے الفاظ کا مطالعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ میں معنی کا جہاں پوشیدہ ہوتا ہے جو ثقافت اور

تہذیب وتمدن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے ذریعے نا صرف خارجی ماحول بلکہ انسانی ذہن کا علم بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ان قدیم تحریروں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو ہم تک پہنچی ہیں اور اُن کی مدد سے قدیم دور کے انسانوں کی داخلی اور خارجی زندگی کی معلومات تک رسائی کی کوشش کی جاتی ہے۔

قدیم تحریوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں دو مشکلات یعنی لپی اور زبان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ دونوں اجنبی ہوں تو انسان تحریر کو نہیں سمجھ سکتا لیکن کسی قدیم تحریر کی زبان بھی مکمل طور پر اجنبی نہیں پائی گئی جو اس امر کی دلیل ہے کہ ان میں سے کوئی بھی زبان مکمل طور پر فنا نہیں ہوئی لہٰذا قدیم تحریروں کو سمجھنے میں زیادہ دقت لپی کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔ مختلف زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں مقامی اور بیرونی الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ”اشوک نے تیسری صدی قبل مسیح میں جو سنگی کتبے نصب کرائے تھے وہ کھروشتی اور برہمی دو قسم کی لپیوں میں پائے جاتے ہیں اور علما کی نظر میں یہ دونوں لپیاں آج ناپید ہو چکی ہیں لیکن آج میرے ساتھ چل کر سرگودھا کی غلہ منڈی میں بیوپاریوں کا بہی کھاتا دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ ایسی ہی لپی سے کام لے رہے ہیں۔ ایسی ہی لپی آپ کو مارواڑی بنیوں کے ہاں نظر آئے گی جو اُسے مڑیا کہتے ہیں اور ایسی ہی ایک لپی کشمیر میں چالو ملے گی۔ رہی ان کتبوں کی دوسری لپی برہمی تو اس کا گورمکھی سے موازنہ کر کے دیکھ لیجیے کہ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں اور بعض محققین کا یہ بیان کہ گورمکھی کی ایجاد سولہویں صدی عیسوی میں محض گروگرنتھ صاحب تحریر کرنے کے لیے ہوئی ہے کس قدر سطحی اور غلط آموز ہے۔“(1)

برصغیر کی موجودہ زبانوں کے مطالعے کے سلسلے میں ان الفاظ کا مطالعہ ضروری ہے جو ہماری تہذیب وثقافت کے عکاس ہیں۔ واضح ہو کہ شمالی بھارت اور پاکستان کی تمام زبانیں دراوڑی ہیں جبکہ ایک عرصے تک مختلف ماہرینِ لسانیات ان کا تعلق آریائی خاندانوں سے جوڑتے رہے ہیں۔ درحقیقت ان کے بنیادی ڈھانچے میں ایک جیسے اصول کارفرما ہیں اور یہ زبانیں انھیں مشترک اصولوں سے اپنا حصہ وصول کر کے ایک سطح پر الگ ہو جاتی ہیں اور اپنی علاقائی نسبت سے پہچانی جاتی ہیں مثلاً سندھی، پنجابی، اُردو، گجراتی، بنگالی وغیرہ۔ زبانوں کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے الفاظ نے بیرونی زبانوں کے اثرات کب اور کیسے قبول کیے اور ان اثرات کے باعث زبانوں میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ الفاظ کا مطالعہ اپنے اندر دلچسپی اور تنوع لیے ہوئے ہے۔ اس میں ہمارے ماضی کے مختلف روپ اور گزشتہ نسلوں کی تہذیب محفوظ ہے۔ الفاظ کے مطالعے کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری رقم طراز ہیں:

> "۔۔۔ جو سرپھرے اپنی گفتگو کی ابتدا یوں کرتے ہیں کہ "ابتدا میں ہمارے مورث پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے اور پتے لپیٹتے تھے۔ کچا گوشت کھاتے اور بھیانک چیخوں سے بھی پہلے محض اشاروں کے سہارے زندگی تیر کرتے تھے" وہ اپنے بزرگوں کو اس مطالعے ہی سے پہچان سکیں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مطالعے سے اُردو زبان کی عظمت وتوانائی کا علم بھی حاصل ہو سکے گا اور منکرین بھی اس کی وسعت ثروت پر ایمان لانے کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔"(۲)

مقامی الفاظ ہماری زبان اور اس سے پہلے کی ان زبانوں میں موجود ہوتے

ہیں جو ہمارے بزرگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ تحریری ریکارڈ کے علاوہ ان الفاظ کو تقابلی اور تاریخی طریقوں سے پرکھا جا سکتا ہے۔ بیرونی الفاظ دوسرے علاقوں سے آتے ہیں اور مانوس اور اجنبی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ مانوس الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو ہماری زبان میں اس طور سے شامل ہو چکے ہیں کہ اب مغائرت کا کوئی احساس باقی نہیں۔ انھیں مستعار لینے کے بعد ان میں مناسب صوتی تبدیلیاں بھی کر لی جاتی ہیں۔ اجنبی الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جنھیں مستعار لینے کے بعد بھی ان کے حوالے سے مغائرت اور اجنبیت کا تاثر موجود رہتا ہے۔ بعض اوقات غیر زبان سے مستعار ایک لفظ مانوس ہوتا ہے جبکہ اسی زبان سے مستعار دوسرا لفظ اجنبی ہوتا ہے۔ مانوس اور اجنبی الفاظ کے درمیان لفظوں کی ایک اور قسم ترجمہ ہے۔ کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لینے کے لیے سب سے مقبول طریقہ اس زبان کی سب سے بڑی لغت کی لفظ شماری ہے لیکن اس طریقے میں کئی نقائص پائے جاتے ہیں اور اسے مکمل طور پر قابلِ اعتماد طریقہ نہیں کہا جا سکتا۔ پروفیسر گیان چند جین نے ان شبہات کا ذکر درج ذیل انداز میں کیا ہے:

''ا۔ لفظ کا تعین کیسے ہو؟ لفظ، مرکب اور محاورے کی حدود متعین نہیں۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کسی روپ کو آزاد لفظ کی حیثیت سے درج کیا جائے یا کسی دوسرے لفظ کے تحت۔

۲۔ ہر زبان میں دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لے لیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کس کو حصولِ زبان میں ضم سمجھا جائے کسے غیر۔

۳۔ علمی اصطلاحات کو کس حد تک زبان کے ذخیرے کا جزو مانا جائے۔ وہ بھی آخر کسی نہ کسی زبان کے لفظ ہیں۔

۴۔ بولیوں کے الفاظ یا پست معیاری زبان کے کن الفاظ کو معیاری

زبان کے ذخیرے میں شامل قرار دیا جائے۔"(۴)

ان مسائل کی وجہ سے ایسا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا جس میں صحت کے ساتھ کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا تعین کیا جا سکے۔ تاہم اُردو لغات کے مقابلے میں انگریزی لغات کے ذریعے لفظ شماری کی زیادہ بہتر مثالیں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح مصنفین، کتب اور دیگر افراد کی لفظ شماری بھی کی جا سکتی ہے۔ عام خیال ہے کہ اُردو شعرا میں نظیرا کبر آبادی اور میر انیس نے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کسی بھی فرد کے ذخیرۂ الفاظ کی تین اقسام ہوتی ہیں۔ پہلی قسم میں وہ الفاظ شامل ہوتے ہیں جنھیں وہ سمجھ سکتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ الفاظ شامل ہیں جنھیں وہ بول سکتا ہے لیکن ان کی تعداد پہلی قسم سے نسبتاً کم ہوتی ہے۔ تیسری قسم میں وہ الفاظ شامل کیے جاتے ہیں جنھیں فرد تحریر میں لاتا ہے اور یہ الفاظ تعداد میں پہلی دونوں اقسام سے کم ہوتے ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنا ذخیرۂ الفاظ جانچنا چاہتا ہو تو اس زبان کی بڑی لغت لے کر اُن الفاظ کو نشان زد کرے جنھیں وہ جانتا ہے۔ بعد میں ان الفاظ کو شمار کر لیا جائے۔ انسان کا ذخیرۂ الفاظ صرف ایک زبان تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک سے زیادہ زبانوں کے الفاظ جانتا ہے۔ سائنسی اور تکنیکی مضامین کے ماہرین اپنے اپنے شعبے کے حوالے سے لاتعداد اصطلاحات سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ زبان اور تہذیب کا ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً الفاظ کی مقبولیت میں کمی کے ساتھ ان کے استعمال میں کمی واقع ہونا۔ الفاظ کا متروک ہونا۔ زبان میں نئے الفاظ کا اضافہ اور آغاز میں ان الفاظ کے استعمال کا کم رجحان اور نئے الفاظ کا آہستہ آہستہ مقبول ہو کے عام ذخیرے کا حصہ بننا۔

تہذیب میں تبدیلی کے ساتھ بعض اشیا کا رواج ختم ہو جاتا ہے اور ان سے تعلق رکھنے والے الفاظ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں مثلاً قدیم داستانوں اور مثنویوں میں زیورات اور دیگر ساز و سامان کی تفصیلات ملتی ہیں جبکہ ان میں سے اکثر اب متروک ہو گئے ہیں۔ بہت سی سماجی رسومات کے الفاظ بھی آج متروک سمجھے جاتے ہیں۔ اصل نام کے استعمال میں کمی اور اس کی جگہ کسی دوسرے لفظ کا استعمال بھی ان لفظوں کے خاتمے کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں اور زبانوں میں بھیانک یا منحوس الفاظ کو مترادف ناموں سے پکارا جاتا ہے اسی طرح عریاں یا خلافِ تہذیب الفاظ کے استعمال سے اجتناب بھی ان الفاظ کو آہستہ آہستہ ختم کر دیتا ہے۔ بعض اوقات صورتِ حال اس کے بالکل برعکس بھی ہوتی ہے یعنی جو لفظ جتنا ممنوع ہوگا اُس میں بقا کی صلاحیت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ عریاں الفاظ کی جگہ شائستہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور بعض الفاظ اتنے ممنوع ہیں کہ محض گالیوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کلیاتِ جعفر زٹلی کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ بظاہر ممنوع یہ الفاظ اٹھارویں صدی میں بھی اسی شکل میں موجود تھے جیسا کہ آج ہیں۔

معیاری زبان کے الفاظ بولی اور عوامی روزمرہ پہ حاوی ہو جاتے ہیں اور بولی کے علاقے میں بھی بولی کے استعمال کو خاصی حد تک کم کر دیتے ہیں کیونکہ معیاری زبان تہذیب کی علامت تصور کی جاتی ہے۔ الفاظ کا متروک ہونا دکھ کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ زبان کے ارتقائی سفر کا ایک مرحلہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر بیس سال کے بعد زبان کے ذخیرے سے نصف فی صد الفاظ ترک کر دیے جائیں اور ایک فی صد نئے الفاظ کا اضافہ کر لیا جائے تو تیرہ سو برس بعد زبان میں اتنی تبدیلی واقع ہو جائے گی کہ دونوں ادوار کی زبانیں دو مختلف زبانیں تسلیم کی جائیں گی۔ ہم معنی الفاظ

میں سے ایک کے زیادہ استعمال اور دوسرے کے نظر انداز ہونے کے قوی امکانات ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کے ذیل کے ہم معنی الفاظ دیکھیے:

"اسرار۔ راز، بھرشٹ۔ ناپاک، ٹھنڈا۔ سرد، جست۔ چھلانگ، جھری۔ درز، جھک جھک۔ بکواس، جھمکا۔ روشنی، جھول۔ ڈھیلا پن، حُب۔ محبت، حسین۔ خوبصورت، ریش۔ داڑھی، قوت۔ توانائی، کومل۔ نازک، مال۔ دولت، مدار۔ محور، نظیر۔ مثال، نفس۔ سانس، ہوش۔ شعور"[۴]

تحریر میں مترادفات بکثرت موجود ہوتے ہیں جیسے پیار۔ محبت، شادی۔ بیاہ، غم۔ دکھ، گھر۔ مکان وغیرہ۔ اکثر دو مختلف المعنی الفاظ میں سے ایک لفظ متروک ہو جاتا ہے۔ ایسے الفاظ بعض صورتوں میں صرف تحریر میں استعمال ہوتے ہیں اور بول چال سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خانہ (گھر)، خانہ (الماری کا خانہ)۔ عرصہ (مدت)، عرصہ (میدان)۔ آب (چمک)، آب (پانی)۔ پیر (مرشد)، پیر (بوڑھا) وغیرہ۔ وقت کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ گھستے گھستے مختصر رہ جاتے ہیں اور بعض اوقات ذخیرۂ الفاظ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگر تصرفات میں کوئی صیغہ عام قاعدے سے مختلف ہے تو قوی امکان ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ ذیل میں اُردو کے بعض تصرفات درج ہیں:

اُردو لفظ	اصل صورت
اتوار	آدتیہ وار
افسر	اوفیسر
آورد	آورد
بالٹی	بالڈی

پپیتا	وَپِتّی
بیکل	ویاگُل
پچھم	پَشچم
پستول	پستَل
پُورَب	پُورو
پَیراہن	پیراہن
پَیرایہ	پیرایہ
چابی	چاوی
چاق	چاغ
حجامت	حجامہ
حَشمت	حِشمہ
حُلیَہ	حِلیَہ
داخلہ	داخِلہ
دُکان	دُکان
رِواج	رَواج
سُبک	سُبک
سَجدَہ	سَجدہ
شعُور	شعُور
شَہاب	شہاب
صاحب	صاحِب
صَدر	صَدر
طَراز	طِراز

فَروش	فِروش
قَلع قَمع	قَلع وقُمع
گِروی	گِرو
مَحور	مِحور
مُشاعرہ	مُشاعِرہ
نَمونہ	نُمونہ
وِداع	وَداع (۵)

اشیا کی ایجادات میں اضافے کے ساتھ ہی ان کے لیے کوئی نہ کوئی نیا لفظ ترتیب دیا جاتا ہے یا غیر زبان سے مستعار لے لیا جاتا ہے۔ سائنسی ایجادات کے بعد مخصوص الفاظ اور اصطلاحات اس کی عمدہ مثال ہیں۔ٹیلیفون۔ ریسیور۔ ڈائل۔ راکٹ۔ ایٹم بم۔ میزائل وغیرہ۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں خاصی تبدیلی اور اضافے ہوئے۔ بعض اوقات جدّت کی خواہش میں سلینگ کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ یہ استعمال بطور خاص طلبہ میں ہوتا ہے۔ اکثر بڑی عمر کے لوگ ان الفاظ کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات دوسرے ممالک کے پھلوں، پھولوں، پہاڑوں، دریاؤں اور انسانوں کے نام جیوں کے تیوں اپنی زبان میں استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ ایسے زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ نئے الفاظ زیادہ تر پرانے مادے کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں لیکن بالکل نئے انداز سے بھی الفاظ بنائے جاتے ہیں۔

اُردو میں متعدد الفاظ کے نام اور معنی پر غور کیجیے۔ بیوی کو گھر والی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ گھر کی انچارج ہے۔ ظہرانہ، عصرانہ اور عشائیہ سے مراد وہ طعام ہیں جو ظہر، عصر اور عشا کے وقت دیے جاتے ہیں۔ چار پائی کو اس کے چار پایوں کی

وجہ سے چارپائی کہا جاتا ہے۔ کمخواب سے مراد وہ کپڑا ہے جو نایاب ہے۔

جغرافیے کا تعلق مکانی حقائق سے ہوتا ہے لیکن الفاظ کے مطالعے کے سماجی اور تاریخی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ یعنی مختلف سماجی طبقوں کے الفاظ میں فرق ہوتا ہے بعض اوقات یہ فرق کم اور بعض اوقات نہایت واضح ہوتا ہے۔ ایک ہی علاقے کے مزدور، کسان اور تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی بول چال میں فرق ہوگا یعنی ان کے زیرِ استعمال الفاظ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ لسانی جغرافیے کے تحت ایک ملک اور علاقے میں زبانوں کے تعین، زبان میں جغرافیائی لحاظ سے بولیوں کے تعین، بولی اور ذیلی بولی کی لغت، بولی کے قواعد، بولی کے پھیلاؤ، مرکز اور عبوری علاقوں کا تعین، بولیوں کا ارتقائی مطالعہ، لفظ کا تاریخی مطالعہ اور الفاظ کا سیاسی، سماجی اور معاشی حوالے سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لسانی جغرافیہ میں بالخصوص مقامات کے ناموں پر تحقیق کی جاتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے آبادی کے انتقال اور زبان بولنے والوں میں اضافے اور کمی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ذخیرۂ الفاظ کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے زبان بولنے والوں پر مرتب ہونے والے مختلف اثرات کا پتا چلتا ہے۔

لسانی جغرافیے کے تحت منفرد الفاظ اور ان کی تاریخوں کے علاوہ زبان کے پورے ڈھانچے کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ اس کے ذریعے زبانوں کے تنوع کا ادراک ہوتا ہے اور نا صرف معیاری زبان بلکہ بولیوں کا بغور مطالعہ بھی اسی کی دین ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، لسانی مقالات (حصہ سوم)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۶، ۲۰۷

۲۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، لسانی مقالات (حصہ سوم)، ص ۲۲۳

۳۔ پروفیسر گیان چند جین، عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۲۴

۴۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، ص ر، ت

۵۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، ض

حروفِ ابجد کی ترتیب و معنویت

زبان کے نظامِ اصوات کی تشکیل و تجسیم ''حروفِ ابجد'' ہی سے ممکن ہے۔ حروفِ ہجا یا حروفِ ابجد وہ بنیادی حروف ہوتے ہیں جو زبان کی اصواتی تجسیم کر کے اُس کی معنویت کو فروغ دیتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں پہلے پہل صرف اصوات تھیں۔ تحریر کا آغاز بہت آہستہ آہستہ اور درجہ بہ درجہ ہوا ہے۔ انسان نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اوّل اوّل چند نقوش ترتیب دیے اور وہ نقوش اپنے اندر ایک خاص قسم کی معنویت رکھتے تھے۔

چونکہ اصوات اپنی نحاس کے اعتبار سے تجریدی ہیں اور ان کی معنویت کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن دیکھا نہیں جا سکتا لہٰذا انسان نے ان کی تجسیم کے لیے نقوش سے کام لیا جو بعد ازاں ''حروفِ ابجد'' کہلائے۔ پروفیسر سیّد محمد سلیم لکھتے ہیں کہ

> ''تحریر کی ایجاد بتدریج ہوئی ہے۔ پہلے انسان نے تفریح کے طور پر تصویریں بنانی شروع کیں۔ اس کے بعد خاکہ نگاری شروع کی اور اس کے ذریعے مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی۔ خاکہ نگاری سے بات نقوش تک جا پہنچی۔ اس سے مزید ترقی کر کے انسان نے حلق سے نکلنے والی آوازوں کے لیے نقوش مقرر کر لیے۔۔۔ یہی نقوش

حروفِ ابجد (Abecedary) یا حروفِ الف با (Alphabet)
کہلاتے ہیں۔"(۱)

اس سے ظاہر ہے کہ انسان نے سب سے پہلے حلق سے نکلنے والی آوازوں کو ترجیح دی اور اس لحاظ سے نقوش بھی ترتیب دیے۔۔۔ابجدی ترتیب حسب ذیل ہے:
ابجد۔ ہوز۔ حطی۔ کلمن۔ سعفص۔ قرشت۔ ثخذ۔ ضظغ

اس حوالے سے شان الحق حقی لکھتے ہیں:

"ابجد: حروفِ تہجی کی وہ ترتیب جو اب ج د سے شروع ہوتی ہے اور جس کے حروف کو ملا کر چند کلمات میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ۔ پہلے نو حروف بالترتیب اکائیوں پر ی تا ص نو دہائیوں پر (۱۰ تا ۹۰)، ق تا ظ سیکڑوں پر مشتمل اور غ ایک ہزار کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ ان اقدار پر طریقِ جمل (رک) مبنی ہے۔"(۲)

مکمل وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ تحریر کا فن کب ایجاد ہوا لیکن اکثر یہودی روایات کے مطابق تحریر کے موجد حضرت ادریسؑ ہیں تاہم "ابجد" کی ایجاد کا سہرا آرامیوں کے سر ہے۔ آرامی زبان میں مذکورہ حروفِ ابجد بامعنی ہیں چوں کہ عبرانی اور عربی زبانیں بھی آرامی کی طرح سامی نسل سے ہیں اس لیے ان زبانوں میں بھی یہ حروف بامعنی ہیں لیکن یونانی اور دیگر زبانوں میں ان حروف کے کوئی معانی نہیں ہیں۔

تفصیل درج ذیل ہے:

تحریری شکل	عبرانی نام	معنی
ا	الف	سینگ
ب	بیت	گھر

ج	گیمیل	اونٹ
د	دالث	دروازہ
ہ	ہے	کھڑکی
و	واؤ	کھونٹی
ز	زین	ہتھیار
ح	حیطہ	جنگلا
ط	طیط	روٹی
ی	ید	ہاتھ
ک	کاف	ہتھیلی
ل	لامد	پھندا
م	میم	پانی
ن	نون	سانپ
س	سامک	مچھلی
ع	عین	آنکھ
ف	فے	منہ
ص	صاد	نیزہ
ق	قوف	گدی
ر	ریش	سر
ش	شین	دانت
ت	تاؤ	نشان

نیز یاد رہے کہ تین ہزار سال قبل از مسیح شہرِ کنعان سے تعلق رکھنے والے آرامی نسل کے بعض اصحابِ فکر نے حلق سے نکلنے والی اصوات کو مجسّم کرنے کے لیے

جو نقوش متعین کیے اُن کی تعداد پہلے پہل کُل ۲۲ تھی یعنی ابجد، ہوّز، حطّی، کلمن، سَعفص، قرشت۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''اُبجد۔ ع۔ اسم مذکر۔ الف بے تے۔ حروفِ تہجّی۔

ابجدیں دو ہیں۔ ایک آدم علیہ السّلام کی ترتیب دی ہوئی، دوسری حضرت ادریس علیہ السّلام کی۔ چناں چہ آج کل ادریس ہی کی ابجد جاری ہے۔ انھوں نے اُسی ابجد کو ترتیب دے کر آٹھ بامعنی کلمے بنائے اور ابجدِ ادریس اُس کا نام رکھا۔ اس ابجد میں عربی کے تمام حروف آگئے ہیں۔ اگر انھیں علاحدہ کر کے ترتیب دیا جائے تو پوری الف بے تے بن جائے۔ ان حرفوں کے اعداد بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ جنھیں حسابِ جمل کہتے ہیں۔ ان کی یادداشت عربی، فارسی، اُردو کی تاریخوں میں بڑی مدد دیتی ہے۔ ابجدِ ادریس کے آٹھوں کلمے یہ ہیں: ابجد، ہوّز، حطّی، کلمن، سَعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ۔''(۳)

حروفِ ابجد کی معنویت جو ''مویدالفضلا'' میں بیان کی گئی ہے اور جسے شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی تصنیف ''لغاتِ روزمرّہ'' میں نقل کیا ہے اُس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

''ابجد: انکار بسیار کرد از عصیاں

ہوّز: پیروی کرد خواہش خود را

حطّی: نابود شد گناہ او باستغفار و توبہ، و احسان گردید بہ او بہ عفو و رحمت

کلمن: کلام کرد بکلمہ کہ محتوی بہ طلب رحمت بود، پس توبہ قبول کرد خدا، و احسان نہاد بہ قبول و رحمت

سعفص: تنگ گردید دنیا بر آدم و سختی آورد بہ او

قرشت: گرفتار شد بہ باعث گناہ، پس پردہ پوشید بہ سبب کرامت واکرام

ثخذ: بگرفت از جانب خدائے تعالیٰ عفو و درگزر

ضظغ: بازداشتہ از آدم گزندگی لا الٰہ الا اللہ محمد ''(۴)

''موید الفضلا'' میں حروفِ ابجد کی جو معنویت بیان کی گئی ہے اُسی کا اُردو ترجمہ صاحب فرہنگِ آصفیہ نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ

ابجد: میرا باپ جو آدم تھا، گناہگار پایا گیا، یعنی اس سے گناہ صادر ہوا۔

ہوز: اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کی۔

حطی: اس کے گناہ اس کی توبہ واستغفار سے دھودیے گئے۔

کلمن: وہ طالب رحمت ہوا، پس اُس کی توبہ قبول کر لی گئی۔

سعفص: دنیا اس کے اوپر تنگ ہوگئی۔

قرشت: اپنے گناہوں کا اقرار کیا جس سے کرامت کا شرف حاصل ہوا۔

ثخذ: خدا نے اُسے قوت دی۔

ضظغ: شیطان کا جھگڑا کلمۂ حق و توحید کی برکت سے مٹ گیا۔''(۵)

علاوہ ازیں ''رسالہ ضوابط عظیم'' میں حروفِ ابجد کی معنویت نہایت اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے ''لغاتِ روزمرۃ'' میں اس طرح نقل کیا ہے کہ

''ابجد: شروع کیا

ہوز: مل گیا

حطی: واقف ہوا

کلمن: متکلم ہوا

سعفص: " اس سے سیکھا

قرشت: ترتیب دیا

ثخذ: محفوظ رکھا

ضظغ: تمام کیا"(۶)

مزید برآں حکیم افہام اللہ انبہونوی مرحوم نے مذکورہ حروفِ ابجد کی معنوی ترتیب کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے کہ

ابجد: ابتدا کرد

ہوز: واقف شد

حطی: در پیوست

کلمن: سخن گفت

سعفص: زود بیاموخت

ثخذ: نگاہ داشت

ضظغ: تمام شد

شمالی افریقہ میں حروف کی ابجدی ترتیب بھی ذرا مختلف ہے جو درج ذیل ہے:

ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفض، قرصت، ثخذ، ظغش۔

(۱) سعفض: صاد کی جگہ ضاد کا استعمال

(۲) قرصت: شین کی جگہ صاد کا استعمال

(۳) ظغش: ضاد کی جگہ ظوے، ظوے کی جگہ غین اور غین کی جگہ شین کا استعمال

حروفِ ابجد کا تعلق علم الاعداد یعنی حساب جمل سے بھی ہے لہٰذا اس حوالے سے یہاں کچھ بنیادی نکات بیان کرنا انسب معلوم پڑتا ہے۔ عبرانی لوگ حروف سے تحریر کے علاوہ گنتی کا کام بھی لیتے تھے کیوں کہ اس زمانے میں ابھی تک اعداد ایجاد

نہیں ہوئے تھے۔انھوں نے اپنی سہولت کے لیے ہر حرف کے لیے کوئی نہ کوئی عدد مقرر کرلیا۔اس حالت میں جب عبرانی حروف،عرب میں منتقل ہوئے تو یہ روایت بھی عربوں میں منتقل ہوگئی۔حروف کے اعداد کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰
س	ع	ف	ص	ق	ر	ش
۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰
ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

بعد ازاں ایران وہندوستان میں جن نئے حروفِ ہجا کا اضافہ ہوا،ان کے اعداد ان کے ہم شکل حروف کے مطابق مقرر کردیے گئے۔

پ	ٹ	چ	ڈ	ژ	ڑ	گ
۲	۴۰۰	۳	۴	۷	۲۰۰	۲۰

زمانۂ قدیم میں قدما ان حروف سے گنتی اور شمار کا کام لیتے تھے۔مثال کے طور پر اگر ۱۲ لکھنے ہوتے تو ''ی ب'' لکھتے تھے۔عرب کے بعد مذکورہ حروف ابجد اور ان سے متصل خصوصیات ''عجم'' کے ہاں چلی گئیں۔اہلِ عجم کی جدت طرازی نے عدد نکالنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔اس نئے طریقے کو حسابِ جمل کہا جاتا ہے۔کسی بھی تاریخی واقعے کو یادرکھنے کے لیے ایک بامعنی جملہ تراشا جاتا اور اس کے اعداد مقرر

کیے جاتے، اس عمل کو اس واقعے کا مادۂ تاریخ نکالنا کہا جاتا۔

اسی طرح حروف ابجد کے استعمال کا یہ طریقہ ہندوستان میں منتقل ہو گیا اور یہاں بادشاہوں کی وفات اور کئی ایک دیگر اہم تاریخی واقعات کے مادۂ تاریخ نکالے گئے۔ علاوہ ازیں اگر حروف ہجا کی ترتیب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم پڑے گا کہ اول اول ان کی ترتیب آرامی طریقے پر یعنی ابجد کے مطابق تھی۔ اس ترتیب میں حسب ذیل اسقام تھے:

(۱) آواز کا خیال نہیں رکھا گیا تھا

(۲) اشکال اور ان کی بناوٹ کا خیال نہیں رکھا گیا تھا

(۳) اس ترتیب میں صوتی رصورتی کوئی مناسبت دکھائی نہیں دیتی

بعد ازاں اس بے ترتیبی اور اس ترتیب میں موجود اسقام کو نحو ولغت کے امام خلیل بن احمد فراہیدی نے محسوس کیا اور اس نے حروف کو حلق کے مخارج کے لحاظ سے درجہ بہ درجہ ترتیب میں رکھا۔ یہ ترتیب حلقی کہلائی۔

ع ح ہ، خ غ ق، ک ج ش ض، ص س ز، ط د ت، ظ ذ ث، ر ل ن ف، م ی و۔

اگرچہ لسانیات کے محققین کے نزدیک خلیل بن احمد فراہیدی کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن عام قاری اور طلبہ کے لیے دشواریاں باقی رہیں اور یاد کرنے میں سہولت پیدا نہ ہوئی۔ بعد میں اس مشکل، دقت اور دشواری کا حل عربی خط کے عظیم فن کار ابنِ مقلہ نے نکالا اور اس نے ہم شکل حروف کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک نئی ترتیب بنائی جو ترتیب ابتث کہلاتی ہے۔

اب ت ث، ج ح خ، د ذ، ر ز، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف ق، ک ل م ن، و ہ ی

ابنِ مقلہ ایک مخترع تھا جس طرح اس کے اختراع کردہ خط نسخ نے خطِ کوفی

کو منسوخ کردیا، اسی طرح اس کی تجویز کردہ ترتیب نے ترتیبِ ابجدی اور ترتیبِ حلقی کو بھی منسوخ کردیا۔ لوگوں کے ذہن میں صرف اس کی اختراع کردہ ترتیب رہ گئی اور باقی تمام ترتیبیں ان کے ذہنوں سے محو ہو گئیں۔

افریقی ممالک مراکش، الجزائر وغیرہ میں ترتیب ابتث ہی رائج ہے مگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ ان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

اب ت ث، ج ح خ، د ذ، ر ز، ط ظ، ک ل م ن، ص ض، ع غ،

(ف ق)، س ش، ہ و لا ی۔

مذکورہ ترتیب میں ''ف'' کے نیچے اور ''ق'' کے اوپر ایک نقطہ ہے اور یہ ترتیب آج بھی ان ممالک میں مقبول ہے۔

اسی طرح اہلیانِ عجم و ہند نے اسی ترتیب میں چند اضافے کیے جس کے بعد اُردو حروفِ ہجا کی ترتیب حسبِ ذیل طے پائی:

اب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، د ڈ ذ، ر ڑ ز ژ، س ش، ص ض، ط ظ،

ع غ، ف ق، ک گ ل، م ن و ہ ھ ء ی ے۔

مذکورہ بالا بیان کردہ حروف جو فی الاصل اصوات کی تجسیمی صورتیں ہیں۔ ان کی ایجاد و اختراع اور ان کی ترتیبوں کے بارے میں تفکر کیا جائے تو جہاں اصل حقائق ملتے ہیں وہیں ذہنِ انسانی کی حیرت انگیز کارفرمائی کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، اُردو رسم الخط، کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳

۲۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص ۲

۳۔ سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، لاہور: رفاہِ عام پریس، ۱۹۰۸ء، ص ۱۳

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، لغاتِ روزمرہ، دہلی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۷

۵۔ سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، مقدمہ

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، لغاتِ روزمرہ، ص ۱۲۸

ترسیمیات اور رسم الخط

انسانی ترسیل کے قاعدوں میں تقریر کو سب سے مکمل گردانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اشارے اور علامات ہیں جن کا تعلق سمعی اور بصری حسوں سے ہے۔ تقریر ترسیل کا سمعی طریقہ ہے۔ ترسیل کے مختلف عارضی اور پائیدار طریقے ہوتے ہیں جیسے ہاتھ اُٹھا کر سلام کرنا، تالی بجا کے خوشی کا اظہار کرنا، انگلیوں کے ذریعے وی کا نشان بنا کر فتح کا اظہار وغیرہ۔ یہ عارضی ترسیل کے زمرے میں آتے ہیں جبکہ پتھر، کاغذ یا چھال پر نقش بنانا پائدار ترسیل میں شمار ہوتے ہیں۔ گراموفون کی ایجاد سے پہلے زبان کی صوتی ترسیل کو عارضی تصور کیا جاتا تھا کیونکہ جو بات کی جاتی تھی اسی وقت فنا ہوجاتی تھی نیز یہ ترسیل مکانی اعتبار سے بھی محدود تھی۔ زمان و مکان کی اس قید کو توڑنے کے لیے ترسیم کا فن وجود میں آیا۔ ترسیم (تحریر) بصری ترسیل ہے اور اس کا شمار پائدار ترسیل میں ہوتا ہے۔ ترسیم اپنی ابتدائی صورت میں حوالے کی نقل کرتی تھی لیکن بعد میں یہ علامات میں تبدیل ہوگئی۔ صوتی حوالے سے ترسیم صوتی زبان کا کوڈ ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ لسانیات میں فنِ تحریر کی بجائے تقریر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کوئی بھی ماہرِ لسانیات تحریر سے غفلت نہیں برتتا۔ زبان کا

قدیم ریکارڈ تحریر یا نقوش کی صورت میں ہی محفوظ ہوتا ہے۔لسانیات میں ترسیل کی اس منزل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جہاں کھال، چھال، پتھر، لکڑی، مٹی کی ٹکیہ وغیرہ پر نقوش بنائے یا کندہ کیے جاتے تھے۔تحریر کی اصطلاح اس کا احاطہ نہیں کرتی اس لیے اس کے لیے ''ترسیم'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ترسیمیات میں اکثر قبل تحریر کی ترسیلی کوششوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اسی طرح مختلف رسم الخط کا ذکر بھی ہوتا ہے اور انھیں تاریخی اعتبار سے بیان کیا جاتا ہے۔ترسیمیات کو علم (سائنس) مانتے ہوئے اس کے مطالعے کو دو شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔تاریخی ترسیمیات اور بیانی ترسیمیات۔تاریخی ترسیمیات میں ترسیمیات کی تاریخ بیان کی جاتی ہے جبکہ بیانی ترسیمیات میں کسی مخصوص رسم الخط کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے نیز اس کے اصول اور اصلاح کی تجاویز پر غور کیا جاتا ہے۔قدیم ترسیم کی دو اقسام ہیں کندہ کاری اور عتیق نگاری۔کندہ کاری (Epigraphy) میں سخت سطح یعنی پتھر، لکڑی، مٹی کی تختی پر سخت نوک والے قلم یا لوہے کی کیل سے کندہ کیا جاتا ہے۔ایسے آثار قدیم ترین ہوتے ہیں۔

عتیق نگاری (Paleography) میں چمڑے یا کاغذ پر نقوش بنائے جاتے ہیں۔اس میں روشنائی اور رنگوں کا استعمال ہوتا ہے مگر نقش کندہ نہیں کیے جاتے۔

زبان کے آغاز کی طرح تحریر کی ابتدا کو بھی ذیل کے طریقوں سے تلاش کیا جاتا ہے۔

آثارِ قدیمہ کے فراہم کردہ ترسیم کے قدیم ترین نمونوں کے ذریعے جن میں قدیم مصری، سمیری اور دیگر خطوط کی باقیات موجود ہیں۔گزشتہ صدیوں کے قبائلیوں کی تصویرکشی کے ذریعے جن میں ریڈ انڈین، اسکیموں اور افریقی قبائل کے

ترسیلی طریقے شامل ہیں۔ ریڈ انڈین تصویروں کے ذریعے پورا واقعہ اور کہانی بیان کرتے ہیں۔ بچوں کی تصویر کشی کے مطالعے کے ذریعے جس میں وہ ایک لکیر کھینچ کے اسے پیڑ یا آدمی کہنے لگتے ہیں لیکن تصویروں میں کوئی توازن نہیں ہوتا کوئی ٹیڑھی ہوتی ہے کوئی سیدھی، کوئی بڑی اور کوئی چھوٹی۔

تحریر کی ابتدا تین ہزار سال قبل مسیح سے ملتی ہے جبکہ انسان اسے بھی کئی ہزار سال پہلے چٹانوں اور غاروں میں تصویر کشی کے ذریعے ترسیل کرتا تھا۔ ترسیم کا سرچشمہ قدیم فنِ مصوری اور نقوش ہیں۔ ترسیم کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں آرائش اور آرٹ کا خیال ختم ہو کر محض ترسیل کا مقصد پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ڈھول کی مختلف آوازوں کے ذریعے پیغام نشر کرنا، آگ جلا اور بجھا کر اپنا مفہوم واضح کرنا، پیڑوں کی شاخوں کو خاص ترتیب سے زمین پر رکھ کر اطلاع دینا۔ رسیوں یا دھاگوں میں گرہیں لگا کر یادداشت کی مدد لینا۔ رسی میں رنگ برنگے دھاگے باندھنا۔ رسی کو مختلف رنگوں سے رنگنا۔ جانوروں کی کھالوں میں موتی اور گھونگھے باندھنا وغیرہ قدیم ترسیم کی مختلف صورتیں ہیں۔ یادداشت کے یہ طریقے تحریر میں شامل نہیں ہیں بلکہ تحریر کا آغاز مصوری سے ہوا۔ آثارِ قدیمہ میں قدیم انسانوں کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں ملتی ہیں جن کا مقصد مذہبی رسوم، جادو ٹونا ہے۔ ہندو مندروں کی نقاشی مذہبی پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا ایک مقصد آرائش بھی ہے جیسے مختلف ہتھیاروں کے دستوں پر نقاشی۔ ایک مقصد ترسیلِ خیال ہے جسے تحریر کی طرف پہلا قدم قرار دیا جاتا ہے۔

پولیس اور فوجیوں کی وردیوں کی آستین، کندھے اور سینے پر نشانات ان کا عہدہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کا شمار امتیازی نقوش میں ہوتا ہے۔ قدیم زمانے کے برتنوں پر بھی کچھ مخصوص نشانات نظر آتے ہیں جو اُن کے آقا کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

بالکل اسی طرح دھوبی ایک خاندان یا گھر کے افراد کے کپڑوں پر نشانات بنا دیتا ہے تا کہ نشانی رہے کہ کون سا کپڑا کس کا ہے۔ قبائلی دور میں راستوں کی نشاندہی کے لیے مختلف نشانات بنا دیے جاتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ راستہ پر خطر ہے یا آسان، مختصر ہے یا طویل۔ عصرِ حاضر میں سڑکوں کے کناروں پر رہنمائی کے لیے مختلف قسم کے نشانات اس کی مثال ہیں۔ ترسیم کے حوالے سے ان خطوط، نقوش اور تصاویر کو اہمیت حاصل ہے جو خیالات کی ترسیل کرتے ہیں اور جنھیں دیکھ کے تمام افراد کے ذہن میں ایک یکساں خیال اور مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

بیانی یا ترجمانی طریقہ میں ایسی تصویر بنائی جاتی ہے جس کا مقصد خیالات کی ترسیل ہوتا ہے۔ اس میں فن کارانہ جزئیات کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے اور مفرد اور مرکب تصویروں کی مدد سے خیالات کی ترسیل کی جاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی کہاوت یا مکمل کہانی بھی اسی انداز میں پیش کر دی جاتی ہے۔ ان تصاویر میں وہ تفصیلات شامل نہیں ہوتیں جن کا پیغام سے تعلق نہیں ہوتا۔ ان تصاویر کی مدد سے پورے پورے گیت بھی بیان کر دیے جاتے ہیں۔ بعض قبائل ہر سال کے موسم سرما کے کسی اہم واقعے کی تصویر بنا لیتے ہیں اور اسی تصویر کی مدد سے سن یاد رکھا جاتا ہے۔ دنیا کی قدیم قوموں میں یادداشتی علامتوں کا رجحان عام تھا لیکن سمیریوں نے علامات کے لیے مٹی کی تختیوں پر اشیا کی تصاویر بنائیں جو ترسیم کی طرف پہلا قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

عراق، مصر اور لبنان کے علاقے ترسیم کے باقاعدہ نظام کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ترسیم کے ارتقا کی مختلف منازل ہیں جیسے ایک نقش میں پوری تصویر پیش کرنا۔ اسی طرح خط کے ذریعے ایک رکن کو پیش کرنا اور نقش کے ذریعے ایک آواز کو پیش کرنا وغیرہ۔ ابتدائی خطوط ملتے جلتے ہیں یعنی خط میں بیشتر نقش

ہوتے ہیں اس میں کچھ رکنی اور کچھ مفرد آوازوں کے نشانات بھی ہوتے ہیں۔ لفظی رکنی خطوط میں سمیری (میسوپٹامیہ میں ۳۵۰۰ قبل مسیح) میں اکادی، بابلی اور آشوری خط شامل ہیں۔ مصر کا ہیروغلیفی (۳۰۰۰ قبل مسیح) میں ہراطیقی اور دیموطیقی اسالیب شامل ہیں۔ ابتدائی ایلمی (۳۰۰۰ قبل مسیح) خلیج فارس کے اوپر وادیٔ سندھ کا خط (۲۵۰۰ قبل مسیح سے ۷۰۰ قبل مسیح تک)، حتی خط (ایشیائے کوچک میں ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۷۰۰ قبل مسیح تک)، چینی خط (اٹھارویں صدی قبل مسیح سے تا حال)، میکسیکو خط (قبل مسیح سے پندرھویں صدی عیسوی تک) ان میں مایا اور ازتیق شامل ہیں، جزیرۂ ایسٹر کا خط وغیرہ شامل ہیں۔

سمیری، مصری اور چینی خطوط پوری طرح پڑھے گئے ہیں۔ سندھی خط بھی تقریباً مکمل طور پر پڑھا جا چکا ہے۔ سمیری اور مصری خط زیادہ اہم ہیں جبکہ چینی نے جاپانی خط کو جنم دیا ہے۔ ابتدا میں سمیری خط لفظ نگاری تھا۔ اس میں جس تصور کو ادا کرنا ہوتا تھا اس کی تصویر بنا دی جاتی تھی۔ سمیریوں نے حکومت کے انتظام و انصرام اور معاشی ضرورتوں کے سلسلے میں اس خط سے کام لیا۔ لفظ نگاری میں بہت دقتیں تھیں۔ تمام اسم معرفہ کا لکھنا ممکن نہیں تھا اور اس میں بہت دیر لگتی تھی اس لیے اس خط میں دو تبدیلیاں کی گئیں۔ اس کی تصویریں مختصر کر کے اسے گیلی مٹی کی لوحوں پر لکھنے کا رواج ہوا۔ مٹی کی تختی پر دائروں کی بجائے لکیر بنانا آسان ہوتا ہے لہٰذا یہ خط لکیری ہوتا گیا۔ یہ لکیریں ابتدا میں پتلی اور بعد میں چوڑی ہو جاتی تھیں بعد ازاں یہ مشہور میخی خط کی شکل اختیار کر گیا۔ اس خط میں دنیا کی مختلف قدیم زبانیں لکھی گئیں اور انیسویں صدی کے آخر تک اس خط کی تحریروں کو پڑھنا آسان ہو گیا۔ سمیری خط میں پہلے دو ہزار نشانات تھے جو بعد میں کم ہو کر چھ سو رہ گئے۔

پروفیسر گیان چند جین کے بقول اس خط میں:

> ''بعض نشانات اپنے مفہوم کو ہو بہو پیش کرتے تھے اور بعض رمزیہ علامتیں تھیں مثلاً پاؤں بنا کر چلنا یا کھڑا ہونا مراد لیا جاتا تھا۔ کنیز کے لیے 'پہاڑ اور عورت' کی تصویر بنائی جاتی تھی چونکہ وہاں غالباً پہاڑی عورتوں کو کنیز بنایا جاتا تھا۔''(۱)

عراق کے شمالی حصے اکاد میں تیسرے ہزارے کے قریب سمیری ختم ہو کر اکادی کا رواج ہو گیا۔ اکادیوں نے میخی خط اختیار کرتے ہوئے نقوش کی سمیری آوازیں بھی رہنے دیں اور ان کے اکادی نام بھی رکھے جن کی وجہ سے نشانات کی کئی آوازیں پیدا ہو گئیں۔ اکاد کے زوال کے بعد بابلی حکومت میں بابلی خط رائج ہوا۔ اس خط میں اکادی کی نسبت کم نشانات تھے اور خطوں کی ترتیب بھی مختلف تھی۔ مصر کا ہیرو غلیفی (نقشِ مقدس) پرانے مندروں اور اہراموں پر پایا جاتا ہے۔ پہلے اسے قدیم ترین خط سمجھا جاتا تھا لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ سمیری خط اور اس کی ارتقائی شکل میخی خط اس سے قدیم ہیں۔ ہیرو غلیفی خط تصویروں پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ سو سے سات سو علامتیں ہیں۔ ابتدائی ایلامی خط کا سمیری خط سے قریبی تعلق ہے۔ یہ بھی ایک تصویری خط ہے۔ اس کی بعض علامت سندھ کے خط سے بھی ملتی ہیں۔ اس کے کتبے کم ہیں۔ ۲۲۰۰ قبل مسیح کے بعد یہ خط نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تھا۔ ہڑپا اور موہنجوداڑو کی کھدائی سے وادیٔ سندھ کی تہذیب برآمد ہوئی۔ اس کھدائی سے دو ہزار مہریں اور تعویز برآمد ہوئے جن پر تقریباً دس ہزار نقوش ہیں۔ یہ خط تصویری، لفظ نقشی اور رکنی تھا تاہم کچھ نشانات حروف جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نشانات قوسین یا کھڑی لکیروں میں بند ہیں جبکہ بعض کے اندر یا باہر کچھ لکیروں کا اضافہ ہے۔ بعض خط دیگر تمام خطوط (سمیری، اکادی، ایلمی، فنیقی وغیرہ) کے نشانات سے ملتے جلتے ہیں۔ کریٹ یونان کے جنوب

میں ایک جزیرہ ہے جو قدیم تہذیب کا حامل ہے۔ یہاں دو طرح کے خطوط ملے ہیں۔ ایک تصویری اور دوسرا لکیری۔ بعض ماہرین کی رائے ہے کہ کریٹ کا تصویری خط مصری خط سے ماخوذ ہے جبکہ بعض کے مطابق اس کا بنیادی خیال تو مصر سے لیا گیا ہے مگر اس کی تشکیل اہلِ کریٹ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ حتّی خط کی دو اقسام تھیں ایک میخی اور دوسری تصویری۔ بعض ماہرین کی رائے میں یہ مصری خط سے متاثر ہے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ اس پر کریٹ کے خط کے اثرات ہیں۔

چینی خط لفظ نقش والا واحد خط ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ اس میں لفظ نقش کے پیچھے چھپی ہوئی تصویر کو بآسانی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ قدیم اور جدید چینی خط میں یہ فرق ہے کہ اب قدیم تصویروں کو مختصر کرتے ہوئے لکیروں کی شکل دے دی گئی ہے۔ چینی خط اوپر سے نیچے کی جانب لکھا جاتا ہے اور اس کی سطریں دائیں سے بائیں طرف بنائی جاتی ہیں۔ ابتدا میں چینی نشانات کی تعداد ڈھائی ہزار تھی جو اب ستر ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ چینی اخبار پڑھنے کے لیے ساڑھے تین ہزار کے قریب نشانات جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کو پانچ سے چھ ہزار نشانات اور کلاسیکی علما کے لیے تقریباً دس ہزار نشانات جاننا ضروری ہیں۔ میکسیکو کا مایا رسم الخط تصویری ہے جو عام طور سے سمجھا نہیں جاتا البتہ تاالیتق اور ازتیق کی بہت سی علامات پڑھی جا چکی ہیں۔ انھیں مایا خط کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیا جاتا ہے۔ ان دونوں خطوط میں اعداد کے اظہار پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ جزیرۂ ایسٹر کا خط ''رونگورونگو'' پڑھنے میں بعض ماہرین کو جزوی کامیابی ہوئی ہے۔ اس کی ۱۵ تختیاں محفوظ ہیں۔ اس میں پورے جملوں کی بجائے محض چند الفاظ بطور یادداشت لکھے جاتے تھے۔ مندرجہ بالا خطوط کے درج ذیل اجزا ہیں:

ایسی تصویریں جنھیں بآسانی شناخت کیا جاسکتا ہے کہ یہ کس چیز کی تصویریں ہیں۔ ایسے نقوش جو تصویروں سے ماخوذ ہیں لیکن اتنے سکڑ چکے ہیں کہ بظاہر اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کس تصور کی تصویریں ہیں۔ بعض نقوش صوت رکنوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ تصویر نگاری کو تحریر پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس کا شے سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے اور وہ اشیا کے حیاتی معنی کی ترسیل کرتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شخص میں تصویر بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ تصویر بنانا ایک مشکل کام ہے اور ٹھوس اشیا کے علاوہ غیر مرئی تصورات کی واضح تصویر بنانا بھی ممکن نہیں۔ نیز یہ کہ کوئی بھی مکمل خط محض لفظ نقش نہیں ہے بلکہ بعض مقامات پر لفظ کی صورت کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

حروف و نقوش کا ایسا تحریری نظام جو اپنے مخصوص اصول و قواعد کے ذریعے آوازوں کی صورت گری کا کام انجام دیتا ہے، رسم الخط کہلاتا ہے۔ جس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح ان زبانوں کی تحریری صورت گری کے لیے مختلف رسم الخط (طرزِ نگارش، طرزِ تحریر) رائج ہیں۔ ''رسم الخط'' کی ایجاد زبان کی ایجاد کے تابع ہے۔ ذہن انسانی نے غیر محسوس طریقے سے زبان کی ایجاد کا کرشمہ کیا۔ زبان کسی ایک وقت میں اور کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں بلکہ اس کے پیچھے صدیوں کی محنت اور تخلیقی واختراعی اذہان کی کارفرمائی شامل ہے۔ اسی طرح رسم الخط کی ایجاد بھی بتدریج ہوئی اور اس میں ضرورت کے مطابق تغیر ہوتا رہا۔ باقاعدہ رائج پذیر رسم الخط کا سفر تصویری رسم الخط کی ایجاد سے تحریری رسم الخط کی ایجاد کا ہے۔

کہاوت ہے کہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔'' انسان نے اپنے مطالب و مقاصد کے ابلاغ کے لیے ''زبان'' ایجاد کی اور اس کے فروغ کے لیے نیز تحریری ضرورت کے پیشِ نظر ''رسم الخط'' ایجاد کیا۔ ابتدا انسان نے ''تصویری'' رسم الخط ایجاد کیے

جن میں نقوش کی کثرت تھی۔ خطِ میخی، خطِ ہیرو غلیفی وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ نقوش کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ انھیں ازبر کرنا مشکل اور دشوار کام تھا اس کے باوصف تصویری رسم الخط ایک طویل عرصے تک رائج رہے اور افراد اپنی تحریری ضروریات انھی نقوش کے ذریعے پوری کرتے تھے۔

الفاظ کا تحریری، تجسیمی نظام اور اس کے اصول وقواعد بتدریج وضع ہوتے آئے ہیں اور ابھی تک ان میں تغیر کا عمل جاری ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق دنیا میں تہذیب وتمدن کے قدیم ترین گہوارے، جہاں سے انسانی تہذیب کا آغاز ہُوا، دو ہیں۔ وادیِ دجلہ وفرات اور وادیِ نیل (عراق ومصر)۔ دونوں ملکوں میں قریباً چار ہزار سال قبل مسیح تحریر کا آغاز ہو چکا تھا۔ عراق میں رائج طریقۂ تحریر کو ''خطِ مسماری'' یا ''خطِ میخی'' (Cuneiform script) کہتے تھے۔ ''مسمار'' اور ''میخ'' اصل میں ''کیل'' کو کہتے ہیں۔ چونکہ عراق میں نیم خشک اینٹوں پر نوک دار کیل سے لکھنے کا رواج تھا اس لیے اس ابتدائی خطِ تحریر کو ''خطِ میخی'' کہا گیا۔ اسی طرح مصر کے لوگ سینٹھے (Papyrus) یعنی ''بردی گھاس'' کے گودے سے ایک خاص قسم کا کاغذ بناتے تھے اور پھر قلم سے اُس پر لکھتے تھے۔ اس طرزِ نگارش کو ''خطِ ہیرو غلیفی'' (Hieroglyphy) کہتے ہیں۔ مذکورہ خطوطِ تحریر قدیم ترین ''رسم الخط'' متصور ہوتے ہیں۔

''رسم الخط'' کی ایجاد دراصل انسان کی اختراعی فکر کا کرشمہ ہے۔ ذہنِ انسانی کئی ایک ''ایجاد واختراع'' کے محرکات کا حامل ہے جنھیں وہ حسبِ ضرورت بروئے کار لاتا رہتا ہے۔ قوی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ فنِ تحریر کا آغاز رفنِ تحریر کی ایجاد کب ہوئی لیکن بعض یہودی روایات کے مطابق فنِ تحریر کے موجد حضرت ادریسؑ ہیں۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے بقول:

''آرامی خط دنیا کا پہلا باقاعدہ تحریری خط ہے۔ دنیا کے بیشتر خطوط آرامی سے ماخوذ ہیں۔''(۲)

محولہ بالا بات کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ عبرانیوں کی کتاب مقدس ''ژنداوستا'' اسی خط میں لکھی گئی ہے۔ منصف خان سحاب نے اپنی کتاب ''نگارستان'' میں رسم الخط کی ایجاد کے حوالے سے چند اہم نکات بیان کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

''انسان نے کب لکھنا شروع کیا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کھنڈرات کی کھدائی سے جو تصویریں سامنے آئی ہیں اُن سے اندازہ لگانا مشکل نہیں قدیم رسم الخط تصویری تھے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں عراق کی سمیری تہذیب اور مصری تہذیبیں ہیں۔ سمیری تہذیب ۴۰۰۰ ق م میں عراق میں آباد تھی۔ اس کی تصویری لکھائی سمیری رسم الخط میں تھی۔ پھر مصر آباد ہوا۔ سمیری خط سے ہیروغلفی (مصری) خط بنا اس کے دو ہزار نشانات تھے۔''(۳)

مذکورہ بالا اقتباس میں منصف خان سحاب نے 'خطِ ہیروغلفی' کے دو ہزار نشانات بتائے ہیں جبکہ پروفیسر سید محمد سلیم کے مطابق:

''مصر میں اہرام کے اندر سے تحریر شدہ کاغذات حاصل ہوئے ہیں لیکن دونوں ملکوں (عراق و مصر) میں تحریر نے تمثیلی اور علامتی دور سے آگے ترقی نہیں کی تھی۔ خطِ مسماری میں ۱۰۰ نقوش ہوتے تھے اور خطِ ہیروغلفی میں ۷۰۰ نقوش استعمال ہوتے تھے۔''(۴)

تصویری رسم الخط سے قطع نظر کہ کل نقوش کتنے تھے۔۔۔ اسے سیکھنا اور پھر رائج کرنا امرِ محال تھا لہٰذا اس پریشانی کو پہلی بار آرامیوں نے محسوس کیا اور حلق سے نکلنے والی آوازوں کے آہنگ، آہنگ کو نقوش کے ذریعے تجسیم کیا اور ان کے نقوش

کے مجموعے کو جس کی تعداد ۲۲ تھی ''خطِ آرامی'' کہا گیا۔ خطِ آرامی نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ اس وقت کی پوری متمدن دنیا میں مقبول ہو گیا۔ اہلِ یونان نے اس خط کو آرامیوں کی ایک شاخ سے حاصل کیا اور اپنی زبان کو اسی خط میں تحریر کیا۔ خطِ آرامی کی سرپرستی بہتر طور سے ہخامنشی بادشاہوں نے کی۔ انھوں نے خطِ آرامی کو اپنی حکومت کا سرکاری رسم الخط قرار دے دیا۔ ایرانی بادشاہوں نے اس خط کو ہندوستان تک متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ خروشتھی اور براہمی خط کے توسط سے ہندوستان کا موجودہ دیوناگری خط بھی خطِ آرامی ہی سے ماخوذ ہے۔ ''تاریخ خط و نوشتہ ہائے کہن'' میں عبدالحیٔ حبیبی نے مذکورہ بات کی تفصیلی توجیہ بیان کی ہے۔ خطِ آرامی میں لکھے گئے کئی ایک تحریری نمونے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے بقول:

> ''آرامی تحریر کا قدیم ترین نمونہ وہ ہے جو جبیل کے بادشاہ احیرام کے تابوت پر درج ہے۔ یہ تحریر ۱۹۲۳ء میں دریافت ہوئی ہے۔ محققین کے نزدیک اس کا زمانہ ۱۲۵۰ قبل مسیح ہے۔ آرامی زبان کا یہ قدیم ترین نمونہ ہے جو اب تک دریافت ہُوا ہے۔''(۵)

عرب میں خطِ آرامی کو قومِ سبا نے رائج کیا۔ یہ قوم جنوبی عرب میں یمن کے علاقے میں حکمراں رہی ہے۔ اس کا زمانہ قریباً ایک ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ خطِ آرامی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں حروف جدا جدا لکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح قومِ سبا کی زبان ''حمیری'' تھی اور رسم الخط ''مُسند'' تھا۔ خطِ مُسند میں ۲۸ حروف تھے۔ قومِ سبا نے خطِ آرامی میں توسیع پیدا کی اور ''چھ'' حروف کا اضافہ کیا۔ جن میں ''ث، خ، ذ، ض، ظ، غ'' شامل ہیں۔ بعدازاں ''ہیراطیقی'' خط ایجاد ہوا جس کا زمانہ ۱۵۰۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ منصف خان سحاب لکھتے ہیں:

''۵۰۰ ق م میں ہیراطیقی خط لکھا گیا۔ اسی دور میں سامی خط سامنے
آیا۔ عبرانی، عربی، یونانی، چینی، روسی اور ہندوستانی زبانوں کے
رسم الخط سامی رسم الخط سے ماخوذ ہیں۔''(۶)

آپؐ کے دور میں خطِ کوفی رائج تھا۔ جب کہ خطِ نسخ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوا۔ جس پر اعراب قریباً ۵۰۰ ہجری میں حضرت علیؓ کے شاگرد ''ابوالاسود دوئلی'' نے لگائے۔ ابوالاسود دوئلی نے ''خطِ نسخ'' پر اعراب نقاط کی صورت میں لگائے، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) زبر کے لیے: حرف کے اوپر ایک نقطہ
(۲) زیر کے لیے: حرف کے نیچے ایک نقطہ
(۳) پیش کے لیے: حروف کے کناروں پر نقطہ ڈالا جاتا
(۴) تنوین کے لیے: دو نقطے اوپر ڈالے جاتے

دراصل ابنِ مقلہ نے خطِ کوفی سے ''چھ'' خط ایجاد کیے تھے:

(۱) ثلث (۲) محقق (۳) ریحان (۴) توقیع
(۵) رقاع (۶) نسخ

جب کہ مذکورہ رسم الخط کے علاوہ ''قلم الجلیل، قلم الدیباج، خطِ مرصع، قلم الزنبور'' بھی ابنِ مقلہ ہی کے زمانے میں رائج تھے۔ بعد ازاں میر علی تبریزی نے خطِ ''تعلیق'' اور خطِ ''نسخ'' کو ملا کر خطِ ''نستعلیق'' ایجاد کیا۔ اس خط کو میر علی ہروی نے ترقی دی اور میر عماد الحسن قزوینی نے اسے بامِ عروج تک پہنچایا۔ خطِ نستعلیق کو اس کی خوبصورتی اور نادرہ کاری کی وجہ سے ''احسن الخطوط'' اور ''عروس الخطوط'' بھی کہا جاتا ہے۔ خطِ ''نستعلیق'' ایک جامع اور وسیع رسم الخط ہے۔ اس نے خطِ تعلیق کو منسوخ کر دیا اور ہر علاقے میں مقبولیت حاصل کی۔ خطِ نستعلیق کی خوبی ہے کہ اس میں خطِ ''تعلیق''

کی طرح حروف کو ملانے کے لیے اضافی رغیر ضروری طور سے زائد لکیریں نہیں کھینچی جاتیں۔ خطِ نستعلیق کو خوبصورت اعضائے انسانی کی تمثیل سمجھا جاتا ہے۔ مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ

"حرف (ل) میں زلفِ یار کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ اس کی (میم) کی گھنڈی گویا جعدِ مشکیں ہے۔ حرف (صاد) میں چشمِ سرگیں کا حسن ہے۔ اس کے آفتابی دائرے حسینوں کے چہرے ہیں، حرف (الف) معشوق کا قامت ہے، حرف (س) کے دندانے گوہر دنداں ہیں۔
حرف (م) کا نزول ساق سیمیں کے مانند ہے، ق اور ف کی گردن حسینوں کی گردن سے مشابہ ہے۔"(۷)

خطِ نستعلیق کے مذکورہ اوصاف اور خوبصورتی کے باعث فارسی اور اُردو زبان میں بعض محاورے بھی گھڑے گئے مثلاً فارسی میں "نستعلیق حرف زدن" اور "نستعلیق گوئی"، پُر تکلف گفتگو کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح اُردو زبان میں مہذب اور شائستہ آدمی کے لیے "نستعلیق آدمی" کا جملہ بولا جاتا ہے۔ مزید برآں جس طرح خطِ طغرا، خطِ گل زار، خطِ غبار وغیرہ کا تعلق براہِ راست خطاطی سے ہے۔ اسی طرح خطِ نستعلیق کا بھی تعلق خطاطی سے ہے لیکن عام طور پر اس سے خطاطی اور آرائشی کام کے بجائے تحریر کا کام زیادہ لیا گیا ہے۔ اسی بنا پر یہ خط بطور تحریری خط رائج ہے۔ خطِ نستعلیق ایک باقاعدہ اور مربوط رسم الخط ہے۔ اس خط نے اپنے سے قبل متعدد رسوم الخط کو رد کر دیا ہے۔ خطِ نستعلیق ایسا تحریری نظام ہے جس کے ذریعے حروف اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ سطحِ قرطاس پر تحریر ہوتے ہیں۔

اُردو زبان کے زندۂ جاوید رہنے کی ایک وجہ اس کا رسم الخط (خطِ نستعلیق) بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خطِ نستعلیق، اُردو زبان ہی کے لیے ایجاد ہوا ہو۔ کیونکہ اُردو

زبان کے الفاظ کا املا خطِ نستعلیق ہی میں بھلا اور خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خطِ نستعلیق خطاطی کا شاہکار تھا لیکن تحریر میں مستقلاً استعمال ہونے سے اس خط کی افادی حیثیت روشن ہوئی اور اب یہی رسمِ خط اُردو املا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ نمایندہ موضوع ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اُس بتِ خوش خط کی زلف

ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

رسوم الخط کی ایجاد اور ان کی رائج پذیری کا لسانیاتی سفر کئی صدیوں کو محیط ہے۔ اگر اس کائنات میں انسان کے ظہور ہونے کا تخیلاتی منظر سوچا جائے تو لاشعور میں کئی ایک مختلف النوع ''آرکی ٹائپ (Architype) '' دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح رُوے زمین پر انسان کا ظہور ایک مکمل روحانی تفسیر رکھتا ہے اسی طرح ''لفظ و معنی'' کی ایجاد اور اس کا تجسیمی تحریری نظام جہاں اپنی لسانی تعبیر لیے ہوئے ہے وہیں اپنے ظہور کی روحانی تفسیر بھی رکھتا ہے۔

کائنات اپنی پہنائی میں کئی طرح کے اَسرار و رموز رکھتی ہے۔ جنھیں انسان کی فکرِ رسا منکشف کرتی رہتی ہے۔ زبان، رسم الخط کی ایجاد ہو یا دیگر اشیا کی ایجاد و اختراع ہو۔۔۔ یہ سب کچھ ذہنِ انسانی کی غیر معمولی صلاحیتوں کی کارفرمائی کی بدولت ہے۔ کسی بھی شے کی ایجاد کی پہلی صورت مکمل صورت نہیں ہوتی، زمانے کے اعتبار سے اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ یوں اس کا ارتقائی سفر ترقی کی حد تک پہنچتا ہے۔

اُردو زبان کی اوّلین صورت کیا تھی؟ اور اب رائج پذیر صورت کیا ہے؟ ایسے ہی ابتدائی رسم الخط کتنے ادق اور دشوار تھے جنھیں اختراعی اذہان کے حامل اذہان نے سہل کیا اور حروف ایجاد کر کے باقاعدہ ایک منظم تحریری رسم الخط ایجاد کیا لیکن انسان

کا ایجاد کردہ اوّلین رسم الخط اپنے تئیں مکمّل ہونے کے باوف نامکمل اور پیچیدہ تھا۔ زمانی اعتبار سے اُس میں تغیّر وتبدل ہوتا رہا اور رسم الخط سے دوسرے رسم الخط کی اختراع و ایجاد ہوتی رہی۔ اپنے اس ارتقائی سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے بعض رسوم الخط ترقی یافتہ حد تک پہنچے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر گیان چند جین، عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۶۵۴

۲۔ پروفیسر سید محمد سلیم، اُردو رسم الخط، کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۱ء، ص ۱۵

۳۔ منصف خان سحاب، نگارستان، لاہور: مکتبۂ جمال ۲۰۱۰ء، ص ۳۱۱

۴۔ پروفیسر سید محمد سلیم، اُردو رسم الخط، ص ۱۴

۵۔ پروفیسر سید محمد سلیم، اُردو رسم الخط، ص ۱۷

۶۔ منصف خان سحاب، نگارستان، ص ۳۱۱

۷۔ پروفیسر فتح محمد ملک، اُردو زبان اور رسم الخط، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹۹

اُردو رسم الخط

مختلف آوازوں کی تحریری علامتوں کا نظام رسم الخط کہلاتا ہے۔ رسم الخط اور زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں کا بنیادی جزو رسم الخط کو قرار دیا جاتا ہے۔ رسم الخط کو نہ تو زبان سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی زبان اپنے مخصوص رسم الخط کے بغیر زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکتی ہے گویا دونوں کا تعلق جسم و جاں کی مانند ہے۔ مختلف علاقوں میں رہنے والے افراد نے طرح طرح کی آوازیں وضع کیں، زبانیں بنائیں اور ان زبانوں کے رسم الخط ایجاد کیے۔ بعض رسم الخط ایک سے زیادہ زبانوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور کہیں کہیں بعض زبانوں کے لیے ایک سے زیادہ رسم الخط استعمال ہوتے ہیں۔ رسم الخط کی اقسام کی طرح ان کے طرزِ تحریر بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ کچھ رسم الخط دائیں سے بائیں طرف کو لکھے جاتے ہیں، کچھ بائیں سے دائیں طرف کو لکھے جاتے ہیں اور کچھ اوپر سے نیچے کی طرف کو لکھے جاتے ہیں۔ رسم الخط کی بنیادی اہمیت یہی ہے کہ وہ اُس زبان کی تمام آوازوں کو جس کے لیے وہ ایجاد ہُوا صحت صفائی اور سہولت سے محفوظ کرے تاکہ پڑھنے والے کی زبان سے وہ آوازیں بالکل اسی طرح ادا ہوں جیسے بولنے والے کی

زبان سے نکلی تھیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری زبان کو درخت اور رسم الخط کو زمین قرار دیتے ہیں۔ جیسے ایک درخت کی نشوونما میں اس زمین کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے جس میں اُس درخت کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں بالکل اسی طرح زبان کے ارتقا میں رسم الخط بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ رسم الخط کو زبان کا آئنہ بھی قرار دیا جاتا ہے جس میں زبان کے تمام خط و خال نظر آتے ہیں۔ اُردو کے لیے فارسی رسم الخط میں مختلف تبدیلیوں کے بعد اسے اپنایا گیا ہے۔ اسے بعینہٖ فارسی رسم الخط کہنا مناسب نہیں۔

اُردو رسم الخط کو ناقص قرار دینے کا آغاز فورٹ ولیم کالج میں اُس وقت سے ہوا جب للولال کوی کی کتاب 'پریم ساگر، ناگری رسم الخط میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ہندوؤں نے انگریزوں کی منصوبہ بندی کے تحت اُردو رسم الخط کو ناگری میں بدلنے کی تحریک کا آغاز کیا۔ یہی وہ طرزِ عمل تھا جو ہندی اُردو کے جھگڑے کے آغاز کا سبب بنا اور جس نے مسلمانوں کو اپنے الگ تشخص کی حفاظت کی خاطر پاکستان کے مطالبے کی طرف راغب کیا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''ابتدا میں ہندوؤں کا مطالبہ صرف اس قدر تھا کہ اُردو کا رسم الخط فارسی کے بجائے ناگری کر دیا جائے۔ اس میں بھی ان کی غرض مندانہ دُور اندیشی اور دانائی کو بڑا دخل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ رسم الخط اور زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور جیسے ہی اُردو کے رسم الخط میں ترمیم و تنسیخ ہوئی یا اسے فارسی سے ناگری میں بدلا گیا، اُردو خود بخود کچھ دنوں میں ختم ہو جائے گی اور ہندی اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ بات یہ ہے کہ ہندی، کوئی الگ سے زبان نہ تھی اس کا نحوی ڈھانچہ اور قواعد کے اصول وہی ہیں جو اُردو کے۔ البتہ سنسکرت الفاظ کے

بکثرت استعمال سے یہ ہندی بن جاتی تھی۔ ہندوؤں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔''[1]

اُردو رسم الخط سیکھنے کے لیے سب سے پہلے اُردو کے حروف تہجی کی شکلیں ذہن نشین کی جاتی ہیں۔ یہ اشکال بہت آسان اور سادہ ہندسی خطوط سے بنی ہیں۔ اُردو کے سارے حروف تہجی چار قسم کی لکیروں اور نقطوں سے مرکب ہیں اور آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اُردو رسم الخط مختصر نویسی کی ایک قسم ہے جو بہت جلد لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے لکھنے کے قواعد مکمل طور سے مرتب ہیں۔ اُردو میں کم وبیش بیاسی آوازیں ہیں جو ہمارے رسم الخط سے مفرد اور مرکب صورتوں میں ادا کی جا سکتی ہیں بعض میں حرکات (زیر، زبر، پیش وغیرہ) سے کام لیا جاتا ہے۔ اُردو زبان کی چار بنیادی آوازیں ہیں: ۱۔ سُر، ۲۔ اکُھر، ۳۔ ہمزہ، ۴۔ غُنّہ، اُردو میں سُروں کی تعداد چوبیس ہے اور ان کی دو اقسام سادہ سُر اور فلکی سُر ہیں۔ سادہ سُروں کی تعداد چودہ جبکہ فلکی سُروں کی تعداد ۱۰ ہے۔ اُردو میں اکُھروں کی تعداد بتیس ہے اور انھیں حجم اور مخارج کے اعتبار سے دو اقسام میں بیان کیا جاتا ہے۔ ہلکے اکُھروں (ب پ وغیرہ) کو الپ پران اور بھاری اکُھروں (بھ پھ وغیرہ) کو مہاپران کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمزہ نہ سُروں میں شمار ہوتی ہے نہ اکُھروں میں بلکہ یہ ان دونوں اقسام کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔ غُنّہ کو عربی میں نون غنّہ اور سنسکرت میں انوسر کہتے ہیں۔ اس کا شمار سُروں میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی مدد سے کم وبیش ہر سادہ سُر فلکی سُر بن جاتا ہے۔ اُردو زبان میں کم وبیش بیاسی آوازیں ہیں جو ہمارے رسم الخط سے مفرد اور مرکب صورتوں میں ادا کی جا سکتی ہیں بعض میں حرکات (زیر، زبر، پیش وغیرہ) سے کام لیا جاتا ہے۔

اگر کسی قوم کی زبان کے رسم الخط کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا جائے تو زبان کی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی متاثر ہوتی ہے اور وہ قوم اپنی اقدار وروایات، ادب وثقافت اور علوم وفنون سے بے گانہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے زبان کا رسم الخط تبدیل کرنا ایسا خسارہ بن جاتا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ خطباتِ گارساں دتاسی کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندی کے پرزور حامی راجندر لال متر نے ۱۸۶۴ء میں کہا تھا کہ ہندوستانی دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی زبان (اُردو) فارسی رسم الخط میں اور ہندوؤں کی ہندوستانی (اُردو) کے لیے ناگری رسم الخط استعمال ہوتا ہے لیکن گارساں دتاسی نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کو ناگری رسم الخط میں ڈھالنے سے عربی وفارسی الفاظ پڑھنا اس سے بھی زیادہ دقت طلب ہو جائے گا جتنا سنسکرت کو فارسی رسم الخط میں پڑھنا۔ اُردو رسم الخط کی تبدیلی کے حوالے سے ناگری رسم الخط کے ساتھ ساتھ رومن رسم الخط کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا۔ جب راجندر لال متر نے ناگری رسم الخط رائج کرنے کے لیے مضمون لکھا اسی سال اُردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی تجویز بھی سامنے آئی جس کے لیے یہ موقف اپنایا گیا کہ اُردو کا کوئی مخصوص رسم الخط نہیں ہے۔ فارسی رسم الخط ہندوؤں کے لیے ناقابلِ قبول ہے اور دیوناگری رسم الخط میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اُردو کے فارسی عناصر کا احاطہ کر سکے۔

گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں زور دے کر کہا کہ زبان اور رسم الخط میں گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے اُردو رسم الخط کو ناگری یا رومن میں تبدیل کرنا اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ انگریزی میں حروفِ صحیح کی تعداد اکیس ہے اور چونتیس آوازیں ہیں۔ تیرہ (۱۳) آوازوں کے لیے مختلف قسم کے مرکبات سے کام لیا جاتا ہے مثلاً

ch، چ، sh ش، th ت۔ انگریزی حروف سے اُردو زبان کی تمام آوازیں ادا نہیں ہو سکتیں۔ اگر اُردو کے لیے رومن رسم الخط اپنایا جائے تو وہ مشتبہ اور دقت طلب ہوگا۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں بڑا BARRA، چھوٹا CHHOTTA، مدھم MADHAM، زخم ZAKHM، گھوڑا GHORRA وغیرہ۔

محنت اور وقت صرف کرنے کے باوجود رسم الخط کے بدلنے سے تمام آوازیں مکمل طور پر ادا ہونے سے قاصر ہیں۔ اُردو رسم الخط پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں نقطوں کی بھرمار ہوتی ہے لیکن یہ نقص کی بجائے اُردو رسم الخط کی بہت بڑی خوبی ہے کیونکہ نقطے کا استعمال نئے حروف کی تعداد میں کمی کر دیتا ہے۔ اُردو رسم الخط میں نو حروف (ب، ح، د، ر، س، ص، ط، ع، ف) ایک دو یا تین نقطوں کی کمی بیشی سے تیئیس ۲۳ حروف کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک اور اعتراض ساکت حروف کے حوالے سے کیا جاتا ہے مثلاً خواہش، خود، خواجہ اور خواب وغیرہ میں 'و' ساکت ہے۔ اُردو میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ انگریزی، عربی، فرانسیسی اور دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ساکت حروف مستعمل ہیں مثلاً Tright, Tought, Night, Fight میں GH ساکت ہے۔ ساکت حروف کی موجودگی ایسا نقص نہیں ہے جو نا قابلِ برداشت ہو۔

حروف کی مناسبت کو پرکھنے کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ ہم جن الفاظ کو ادا کرنا چاہتے ہیں رسم الخط اس میں کس حد تک کامیاب ہے۔ اُردو میں ت اور ٹ دو آوازیں ہیں۔ رومن میں ان دونوں کے لیے ایک ہی لفظ T استعمال ہوگا جب اُردو میں تم کہنا مقصود ہوگا تو رومن میں TUM لکھیں گے جب 'آتا' کہنا چاہیں گے تو 'آتا' لکھا جائے گا اور 'کاتا' کہنا ہوگا تو 'کاٹا' ہو جائے گا۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود

ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ رومن حروف اُردو کی بہت سی آوازوں اور تلفظ کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

رومن رسم الخط کو فوقیت دینے سے وہ تمام ادب جو اب تک عربی، فارسی سے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے یا وہ اُردو ادب جو اب تک تخلیق کیا جا چکا ہے اسے از سرِ نو رومن خط میں منتقل کرنا ہوگا۔ یہ کام نا صرف مشکل بلکہ نا ممکن ہے۔ کئی سو سال کی محنت جو اُردو کے علمی و ادبی ذخیرے کو جمع کرنے میں صرف ہوتی ہے رائیگاں جائے گی۔ ادبی سرمایہ ایک دو سال میں جمع نہیں ہو سکتا۔ وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی کے باجود بھی اس مسئلے کو حل کرنا آسان نہیں ہوگا کیونکہ ایک ساتھ پرانے ادب کو نئے رسم الخط میں منتقل کرنا اور تخلیقِ ادب کی کاوش جاری رکھنا ممکن نہیں۔ اگر صرف موجودہ علمی و ادبی کام جاری رکھنے کا فیصلہ ہوگا تو ماضی کا ادبی سرمایہ میوزیم کی زینت بن جائے گا۔ آئندہ نسلوں کے لیے قرآن مجید کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی زبان و رسم الخط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کی بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ کسی دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجیے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورتِ قومی لے کر اٹھے گی۔ جن جن لوگوں نے اقوموں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے اُن سب نے یہی ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔“(۲)

زبان قوم کے مزاج کا آئینہ ہے اور رسم الخط زبان کی خصوصیات کا محافظ۔

اگر کسی ایک کوترک کیا جائے یا تبدیل کیا جائے تو قوم کی انفرادی حیثیت پہ کاری ضرب پڑے گی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری رسم الخط کو زبان کا لباس ہی نہیں جلد قرار دیتے ہیں اور جلد اُتار دینے سے زبان کی اصل صورت باقی نہیں رہ سکتی۔ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے بالکل اسی طرح اقوام اپنے رسم الخط سے پہچانی جاتی ہیں۔ اُردو رسم الخط ہماری فکری اور جمالیاتی روح کی نمائندہ علامت ہے۔ اس حقیقت سے باخبر ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب رومن رسم الخط کو پھیلانا چاہتی ہے۔ انگریزی اور روسی زبانوں نے اپنے علمی و ادبی خزانے عام کرنے کے لیے رسم الخط میں تبدیلی نہیں کی بلکہ جن زبانوں کو اپنے ادب سے متاثر کرنا مقصود تھا اُن میں ادبی سرمائے کو تراجم کی صورت میں منتقل کیا۔ فرض کیجیے کہ کسی انگریز کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ وہ انگریزی کے لیے ہمارے رسم الخط کو اپنانا چاہتا ہے تو کیسی مضحکہ خیز صورت سامنے آئے گی۔ انگریزی الفاظ کو اُردو رسم الخط میں پڑھنے میں جتنی دقت ہوگی، اُردو الفاظ کو رومن رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے میں اس سے کہیں زیادہ اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان کے دورِ اقتدار کے آغاز کے ساتھ ہی رسم الخط کا مسئلہ پھر سر اٹھانے لگا۔ وہی پرانی تجویز جس کا مقصد فارسی رسم الخط کو ترک کر کے رومن رسم الخط اپنانا تھا۔ رسائل و اخبارات کے ذریعے عوام کی آرا پر مبنی سروے کیے گئے، رائے شماری کا سلسلہ شروع ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند ایک کے سوا عوام و خواص کی اکثریت نے اُردو کو رومن رسم الخط کا لبادہ اوڑھانے کی تجویز رد کر دی۔ اُردو رسم الخط چند سال نہیں کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے موضوعِ بحث ہے۔ آج بھی کسی نہ کسی گوشے سے اس کے خلاف آوازیں سننے میں آتی ہیں۔ زبان و ادب کے سنجیدہ ماہرین نے اس مسئلے کی طرف خصوصی توجہ کی اور اُردو رسم الخط کی حمایت

میں پُر زور مضامین لکھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے میں:

''یہ خیال گمراہ کن ہے کہ کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں پوری صحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے یا اور زبان کے مطالب کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں من وعن ظاہر کیے جا سکتے ہیں اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر زبان کے لیے ایک جداگانہ رسم الخط کی ضرورت نہ ہوتی۔ ساری زبانیں ایک ہی قسم کے حروف یا رسم الخط سے اپنا کام چلا لیتیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل الفاظ دیکھیے (1)Head, (2)Hid, (3)Hell, (4)Hill اگر انہیں اُردو میں لکھا جائے تو ''ہڈ'' اور ''ہل'' کے سوا کسی اور طرح لکھنا ممکن نہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری ادائے تلفظ میں حارج ہوگی۔''(۳)

انگریزی میں ایک دو نہیں ہزاروں ہم تلفظ الفاظ ہیں۔ دل، پہاڑ، تمام، طالب، وسیع، غریب اور خدا جیسے الفاظ رومن رسم الخط میں دیکھیے: Khuda, Gharib, Wasi, Talib, Tamam, Pahar, Dil یعنی ڈل، پہار، ٹمام، ٹالب، وسی، گریب، کھدا۔۔ تلفظ اور معنی دونوں مجروح ہو رہے ہیں۔ ء، غ، اور خ کی آوازیں رومن میں ادا نہیں کی جا سکتیں۔

اُردو رسم الخط میں حروفِ تہجی یعنی ا ب ت ث وغیرہ کی تعداد ۵۰ ہے انگریزی میں ۲۶، ہندی یا ناگری میں ۴۲ عربی میں ۲۹ اور فارسی میں ۳۳ ہے یعنی اُردو زبان میں آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ اُردو نے اپنے حروفِ تہجی میں عربی، فارسی، ہندی یعنی آریائی اور سامی خاندانوں کی زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لیے اس میں انگریزی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہو گئے

ہیں اور ان میں کوئی ایسی آواز نہیں جسے ادا کرنے میں اُردو بولنے والوں کو دقت ہو۔

اُردو میں ڈ، ٹ، ڑ، بھ، تھ، ٹھ، کھ، جھ، دھ جیسی آوازیں بھی ہیں جو عربی، فارسی میں موجود نہیں یعنی اُردو رسم الخط اپنی وسعت کے اعتبار سے بہت سی زبانوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ گارساں دتاسی نے اُردو کے لیے لاطینی رسم الخط کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ

> ''اُردو کو لاطینی خط میں لکھنا مفید نہ ہوگا اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھ مزید ایسے حروف کی ضرورت ہوگی جن پر مخصوص علامتیں لگی ہوں گی۔ یہ ایک نیا نظامِ تہجی ہوگا اور ان کا سیکھنا حروفِ تہجی سے بھی زیادہ دشوار ہوگا۔''(۴)

اُردو رسم الخط انگریزی اور ناگری کے مقابلے میں کم جگہ لیتا ہے جس سے وقت اور کاغذ کی بچت ہوتی ہے۔ اُردو میں ایک آسانی یہ بھی ہے کہ اعراب کے لیے الگ سے حروف نہیں ہیں بلکہ زیر، زبر، پیش کے مختصر نشانات سے اعراب کا کام لیا جاتا ہے۔ اُردو میں حروفِ تہجی کی زیادہ تعداد کے باوجود ان کا بنانا اور قابو پانا آسان ہے۔

۱۔ا ۲۔ب پ ت ٹ ث ۳۔ج چ ح خ

۴۔د ڈ ذ ۵۔ر ڑ ز ژ ۶۔س ش ۷۔ص ض

۸۔ط ظ ۹۔ع غ ۱۰۔ق ۱۱۔ک گ

۱۲۔ل ۱۳۔م ۱۴۔ہ ۱۵۔ی

مندرجہ بالا پندرہ بنیادی اشکال کے حروف پر قابو پالیا جائے تو ان کی مدد سے باقی تمام حروف خود بخود بن جاتے ہیں۔ اُردو حروف بناوٹ کے اعتبار سے سادہ اور ناگری اور انگریزی سے تعداد میں کم ہیں۔ انگریزی میں ک کی آواز کے لیے K اور

Q کے حروف موجود ہیں اس کے باوجود Class میں ک کی آواز C سے ظاہر کی گئی ہے۔'ز' کی آواز کے لیے Z موجود ہے لیکن Has اور Please میں 'ز' کی آواز S کی مدد سے پیدا کی گئی ہے۔'ف' کی آواز F سے نہیں Ough اور Ph سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ Phone Phonetic Tough,Rough, وغیرہ کی مثالیں ملاحظہ کیجیے۔'ج' کی آواز کے لیے G اور J دونوں حروف استعمال ہوتے ہیں۔ Judge,General وغیرہ 'چ' کی آواز کبھی Ch اور کبھی Ture سے ظاہر ہوتی ہے Picture,Match, وغیرہ کی مثالوں پر غور کیجیے۔'ش' کی آواز Sh کے علاوہ بھی پیدا کی جا سکتی ہے مثلاً Patient, Tution,Ocean,Sure,Machine وغیرہ۔'س' کے لیے S کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن Receive اور Centre وغیرہ میں c سے 'س' کی آواز نکالی جاتی ہے۔

اُردو رسم الخط کی تبدیلی ہماری قومی ضرورت نہیں چند افراد کا نفسیاتی مسئلہ ہے جو ہر صورت میں انگریزی کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھیں اپنی تہذیب، ورثہ، معاشرہ، ادب، لباس اور زبان غرضیکہ ہر وہ چیز جو تصنع سے پاک ہے، بُری لگتی ہے۔

رومن رسم الخط اختیار کرنے سے ہم کسی صورت یورپ کے قریب نہیں آ سکتے لیکن اپنے رسم الخط کو قائم رکھ کر اپنے علمی و ادبی سرمائے کی حفاظت ضرور کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مشترک لغت کے باعث ہمسایہ ممالک سے مضبوط تعلقات بھی قائم کر سکتے ہیں۔ اُردو رسم الخط کا مسئلہ ہماری بقا کا مسئلہ ہے۔ مغرب کے پُر فریب ہتھکنڈوں کا شکار ہونے کی بجائے رسم الخط کے حوالے سے ایک ٹھوس اور فیصلہ کن موقف وقت کی اہم ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو املا اور رسم الخط اصول و مسائل، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷

۲۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، تحریکِ آزادی، خورشید احمد (مرتب)، ڈھاکہ: اسلام پبلی کیشنز، س ن، ص ۴۳۶

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو املا اور رسم الخط اصول و مسائل، ص ۷۸

۴۔ خطباتِ گارساں دتاسی حصہ دوم، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۰ء، طبع دوم، ص ۲۳

اُردو زبان کا نظامِ اعراب

علامات اور حرکات وسکنات کی منظم ترتیب جس کے ذریعے کسی بھی لفظ کا اصل تلفظ ادا کیا جاتا ہے اور جس سے اُس لفظ کا مخصوص معنوی انفراد قائم ہوتا ہے نظامِ اعراب کہلاتا ہے۔ ''اِعراب'' عربی زبان کا لفظ ہے اور عربی زبان میں یہ اصطلاح، مخصوص الفاظ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اُردو زبان میں اسے عام معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں اِعراب کے لیے ''حرکات وسکنات'' کی ترکیب بھی مروج ہے۔ لیکن اس ترکیب کے مقابلے میں مفرد لفظ ''اِعراب'' زیادہ بہتر ہے۔ عام طور پر ''اِعراب'' سے مراد ''زبر، زیر، پیش، جزم'' ہے۔ جس جگہ فقط ''زبر، زیر، پیش'' ہی سے مراد ہو وہاں ''حرکات'' کا لفظ استعمال کیا جانا چاہیے۔

مذکورہ حرکات میں سے کوئی بھی حرکت جس حرف پر ہوگی اُسے ''متحرک'' کہا جاتا ہے اور جس پر ''جزم'' ہوگا، اُسے ''ساکن'' کہا جاتا ہے مثلاً ''دَرْ'' میں ''دال'' متحرک ہے اور ''رْ'' ساکن ہے۔ ان دونوں (زبر، جزم) کے مجموعے کا نام ''اِعراب'' ہے۔ ''اِعراب'' کے بغیر الفاظ کا تلفظ درست ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ''اِعراب'' صحتِ تلفظ اور صحتِ اِملا، ہر دو لحاظ سے اہم ہیں۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اعراب سے مراد ہیں: زبر، زیر، پیش اور جزم۔ زبر، زیر، پیش کو حرکات بھی کہتے ہیں۔ اُردو میں عام لفظوں پر زَبر، زیر لگانے کا رواج نہ تھا اور نہ ہے۔ مگر اب حالات نے کچھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ بہت سے لفظوں پر اعراب کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ عام الفاظ کے علاوہ، بعض مقامات یقیناً ایسے ہیں جہاں اعراب نگاری کو لازم قرار دینا چاہیے۔''(۱)

''زبر، زیر، پیش'' کو حرکاتِ ثلاثہ بھی کہتے ہیں۔ الفاظ کے تلفظ میں جو آسانی پیدا ہوتی ہے وہ انھی حرکات کی بدولت ہے۔ ان حرکات وسکنات کے مجموعے کو اِعراب کہتے ہیں اور ان کو اِعراب اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اہلِ عرب کی ایجاد ہیں۔ اُردو میں کُل چھ (٦) علامات بطور اعرابی علامات استعمال ہوتی ہیں جن کے ذریعے الفاظ کے درست تلفظ کا تعین کیا جاتا ہے۔

(ا) زبر (فتح): علامت (َ) زبر''ا'' (لف) ہی کی ایک خفیف آواز ہے۔ یہ نصف ''الف'' کے برابر ہوتی ہے جب کہ کھڑا زبر (ٰ) پورے 'الف'' کے برابر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں فارسی کے بعض حروف کے آخر میں ''ہ'' آتی ہے جسے ''ہائے مخفی / ہائے مختفی'' بھی کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ ''ہ'' بطور اِعراب استعمال ہوتی ہے اس لیے اسے ''ہائے اِعرابی'' بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً ''روزہ، دیدہ، شگفتہ، ہفتہ، تشنہ وغیرہ۔

زبر (فتح): الف کی ہلکی سی رخفیف آواز جو ''زبر'' کہلاتی ہے اُسے عربی میں ''فتح'' بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح جس حرف پر زبر آئے رفتح آئے اُسے ''مفتوح'' کہتے ہیں مثلاً اَمجدَ، اَکملَ، اَخترَ، رَہبرَ وغیرہ۔ ''امجد'' میں ''الف وجیم'' پر زبر رفتح ہے اس اعتبار سے دونوں حروف ''مفتوح'' ہیں باقی علیٰ ہذا القیاس۔۔۔

(۲) زیر (کسرہ): علامت (ِ) زیر، دراصل ''ی'' کی ہلکی سی رخفیف آواز ہے اور حرف کے نیچے لکھی جاتی ہے۔ یہ نصف (ی) کے برابر ہوتی ہے جب کہ کھڑی زیر (ٖ) مکمل، پوری (ی) کے برابر ہوتی ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں اِک، اِس، دِل، ہِل، ظِل وغیرہ

مذکورہ بالا الفاظ کا حرف اوّل ''مکسور'' ہے یعنی ''کسر (زیر)'' والا ہے۔

پیش (ضمہ): علامت (ُ)

پیش رضمہ اصل میں ''وْ'' کی ہلکی سی رخفیف آواز ہے۔ یہ حرف کے اوپر لکھی جاتی ہے اور چوں کہ پیش کو عربی میں ''ضمہ'' کہتے ہیں اس لیے جس حرف پر یہ آئے اُسے ''مضموم'' کہتے ہیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں: اُس، تُم، اُردو، کُل، قُل وغیرہ

مذکورہ بالا الفاظ میں'' اُس، تُم، کُل، قُل'' کے حرف اوّل مضموم ہیں جبکہ'' اُردوُ'' میں حرف اوّل اور سوم مضموم ہیں۔

تنوین: علامت (ٍ ٌ ً)

تنوین اصل میں دو زبر، دو زیر اور دو پیش اکٹھا آنے کو کہتے ہیں۔ اُردو میں زیادہ تر دو زبر والی تنوین استعمال ہوتی ہے جو عموماً ''الف'' پر لکھی جاتی ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

امکاناً، اخلاقاً، اصولاً، جواباً، رسماً، غالباً، احتجاجاً وغیرہ

مزید برآں دو زبر والی تنوین (ۃ) ''الف'' پر بھی لکھی جاتی ہے اور آواز ''الف'' سے پہلے والے حرف کے ساتھ ''ن'' کی دیتی ہے یعنی تخفۃً، دفعۃً، ارادۃً، اشارۃً، واقعۃً وغیرہ

جزم: علامت (ْ)

جزم، سکون، تسکین کے معنی ''خاموشی'' کے ہیں۔ جس حرف پر (ْ) کی

علامت ہو یعنی اس حرف پر ''زبر، زیر، پیش'' وغیرہ کی علامت نہ ہو تو اُسے مجزوم کہتے ہیں۔ اس کی اصل علامت (ْ) ہے تاہم اسے یوں ''^'' بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ہمْ، کمْ، جمْ، نمْ، درْ، ذرْ وغیرہ

کبھی اور کسی صورت بھی ''جزم'' لفظکے آغاز یعنی پہلے حرف پر نہیں آتی نیز اُردو کا ہر آخری حرف ساکن (مجزوم) ہوتا ہے۔

تشدید: علامت (ّ)

لفظ ''شد'' سے ''تشدید'' ہے۔ عربی میں ''تشدید'' کے لغوی معنی ''سخت کرنا اور ''استوار'' کرنا کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد کسی حرف کو دو مرتبہ ایک ساتھ پڑھنا ہے۔ جب کوئی حرف ''مکرّر'' اپنی آواز دیتا ہے تو اس پر علامت شد (ّ) ڈالی جاتی ہے اور جس حرف پر ''شد'' ہوتی ہے اُسے ''مشدد'' کہتے ہیں۔ چند لفظی مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

مزیّن، مُشدّد، مکرّر، مکرّم، مقدّس، مودّب، مقوّی وغیرہ

اُردو زبان میں ''اِعراب'' کو بنیادی اور اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اِعراب کا خیال نہ رکھا جائے تو الفاظ کے درست تلفظ کا تعین کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کم و بیش ہر زبان میں ''ہم شکل'' الفاظ بھی موجود ہوتے ہیں جن کا املا ایک جیسا ہوتا ہے مگر اِعراب مختلف ہوتے ہیں جن سے اُن کی معنوی شناخت سامنے آتی ہے۔ اس حوالے سے چند اہم مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

الفاظ	معانی
اَبّا	والد
اِبا	انکار

بَدْر	پورا چاند
بَدَر	باہر
عالِم	جاننے والا
عالَم	دنیا، جہان
خَلق	مخلوق
خُلق	اخلاق
جَد	دادا
جِد	کوشش
خاتِم	آخری
خاتَم	انگوٹھی
عَود	واپس
عُود	لکڑی

مذکورہ بالا الفاظ کے علاوہ بھی متعدد ایسے ہم شکل الفاظ ملتے ہیں جن کا املا (حروف) ایک جیسے ہیں لیکن ان کے مابین معنوی تحدید ہوتی ہے۔ ایسے الفاظ کو "متشابہ" الفاظ بھی کہتے ہیں۔ ان کے الگ الگ معنوی تعین کے لیے "اِعراب" بے حد ضروری ہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ اور حل طلب ہے کہ ابھی تک اُردو کا نظامِ اِعراب کامل ترین نہیں ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ پروفیسر محمد سلیم نے بیان کی ہے:

> "اُردو اِملا کی مشکلات اُردو اِعراب کی وجہ سے ہیں۔ عربی خط میں اعراب کی کُل چھ شکلیں استعمال ہوتی ہیں لیکن اُردو زبان میں اعراب کی بارہ شکلیں رائج ہیں۔"(۴)

چونکہ عربی زبان کی طرح اُردو زبان میں بھی حروفِ علّت "ا، و، ی" تین

ہیں یہ کبھی حرف صحیح کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور اپنی پوری اور درست آواز نکالتے ہیں۔ اس حالت میں انھیں ملفوظ کہتے ہیں۔ اسی طرح کبھی حروفِ علت ہی کے طور پر (جنھیں حرفِ اعرابی بھی کہا جاتا ہے) استعمال ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ ملفوظ نہیں ہوتے بلکہ ماقبل حرکت کو تقویت دیتے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

حروف صحیح کے طور پر ''الف کی حالتیں''

ابتدا: اکمل، امجد، اختر

درمیان: گئے، گئی

آخر: ضیاء، اشیاء

درمیان اور آخر میں ''الفِ صحیح'' کا اظہار ''ہمزہ'' (ء) سے ہوا ہے تاہم اب عہدِ حاضر کی اُردو گرامر میں املا کے حوالے سے نئی تجاویز کے مطابق ''ضیاء، اشیاء، انشاء'' وغیرہ ایسے الفاظ کے آخر پر ''ہمزہ'' ترک کرنے کا کہا گیا ہے۔

حرفِ اعرابی کے طور پر ''الف کی حالتیں''

معروف: جال، بال، شال

ممدود: آم، آپ

تفخیم: بال (گیند)

حرفِ صحیح کے طور پر ''واو کی حالتیں''

ابتدا: واحد، وحید

درمیان: محور، انور

آخر: محو، نحو، سرو

حرفِ اعرابی کے طور پر ''واو کی حالتیں''

معروف: طور، بول، اصول، نور

مجہول: بول (لفظ)، گھول، کھول

محدود: ڈھول

مخلوط: خواہر، خواب، خواہش

معدولہ: خور، خورشید، خود

حرفِ صحیح کے طور پر ''یا کی حالتیں''

ابتدا: یونس، یوسف

درمیان: کبیر، فقیر، کلیر شریف

آخر: ۔۔۔۔۔

حرفِ اعرابی کے طور پر ''یا کی حالتیں''

معروف: ہیر، نیل

مجہول: ریت، بیل (پودا)، بیر، کھیل

مخلوط: کیا، کیوں، بیاہ، پیاس وغیرہ

مذکورہ بالا تمام نکات سے پتا چلتا ہے کہ اُردو کے نظامِ اعراب میں کس قدر پیچیدگیاں موجود ہیں۔ اس میں ضروری ہے کہ حروف کے محلِ استعمال کے پیشِ نظر علامات لگائی جائیں تاکہ اعرابی علامات کے ذریعے اُن حروف کی مکمل وضاحت ہو سکے۔ جہاں اُردو کے نظامِ اعراب میں کہیں کہیں ژولیدگی یا پیچیدگی کا احساس ہوتا ہے وہیں اس نظام کی بعض عمدہ خصوصیات بھی ہیں جو اسے اپنی معاصر زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

اُردو اعراب میں ''تشدید'' کا استعمال بہت اہمیت کا حامل ہے جس کے ذریعے ایک ہی حرف کو الگ الگ دوبار لکھنے یا پڑھنے سے بچا جاتا ہے۔ صرف علامت لگا دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلاں حرف دوبار بولا جائے گا۔ ہندی زبان

والے اس سے محروم ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے الفاظ کے املا میں طوالت آجاتی ہے۔ اسی طرح اگر اُردو کے اکثر الفاظ پر اِعراب نہ بھی لگائے جائیں تو ان کا تلفظ ادا کرتے وقت کوئی مشکل پیش نہیں آتی لیکن ہندی زبان کے الفاظ کے تلفظ کا تعین اس کے ''ماترائی نظام'' سے ہوتا ہے۔ اگر کسی لفظ کے حرف پر ماترا نہ لگایا جائے تو لفظ مبہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ محمد الیاس برنی لکھتے ہیں کہ

> ''ہندی حروفِ علت کا کام اُردو حروفِ علت سے بڑی حد تک چل جاتا ہے اور بآسانی چل جاتا ہے لیکن اُردو اِعراب کی بعض خصوصیات، خوبیاں اور سہولتیں ہندی میں بالکل ندارد ہیں۔''(۳)

اُردو زبان کا نظامِ اِعراب اگرچہ بعض حوالوں سے اصلاح طلب ہے لیکن اس میں کچھ ایسی نادر اور نایاب اعرابی خصوصیات ہیں جو ہندی اور اس جیسی دیگر زبانوں میں نہیں ہیں۔ اُردو زبان کا اِعرابی نظام، عربی زبان کے نظامِ اِعراب سے مستعار ہے لیکن اس میں اُردو زبان کی اپنی لفظی ضروریات کے مطابق تصرفات بھی کیے گئے ہیں۔ اُردو زبان کے زندۂ جاوید ہونے میں اس کے اجزائے ترکیبی کے علاوہ رسم الخط اور اس کے نظامِ اعراب کا کردار کلیدی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید حسن خاں، اُردو کیسے لکھیں، لاہور: رابعہ بک ہاؤس، س ن، ص ۸۹

۲۔ پروفیسر سید محمد سلیم، اُردو رسم الخط، کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۱ء، ص ۸۳

۳۔ محمد الیاس برنی، اُردو ہندی رسم الخط مشمولہ اُردو زبان اور رسم الخط، پروفیسر فتح محمد ملک، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۵

کوائف

نام : ڈاکٹر رابعہ سرفراز

مصروفیت : استاد شعبۂ اُردو
جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

مطبوعات

۱۔ شبنم سے مکالمہ (نظمیں)

۲۔ محبت زمانہ ساز نہیں (نظمیں)

۳۔ سیدنا اُحید ﷺ (سیرت نبوی ﷺ)

۴۔ سدا وہ میرے ساتھ (انگریزی گیتوں کے تراجم)

۵۔ مشرق کی سمت ایک سفر (ہرمن ہیسے کے ناول The Journey To The East کا اُردو ترجمہ)

۶۔ اشاریہ

۷۔ سخن زاد (غزلیں)

۸۔ کوئی رُت کوئی رستہ ہو (آزاد نظمیں)

۹۔ توضیحی مطالعات

۱۰۔ تنقیدی جائزے

۱۱۔ اقبال آثار

۱۲۔ اقبال کا نظریۂ فن

۱۳۔ اقبال کا شعری اسلوب

۱۴۔ ترجمہ۔ فن اور اہمیت (ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد سے شائع کردہ)

۱۵۔ تحقیدی مطالعات

۱۶۔ عکس در عکس (غزلیں)

۱۷۔ اُردو زبان اور بنیادی لسانیات

۱۸۔ نسخہ ہائے وفا کی عروضی تخریج

زیرِ طبع

۱۔ وہی جہاں ہے ترا جس کو تُو کرے پیدا

۲۔ خواب آثار (نظمیں)

۳۔ تحقیقی و تنقیدی افکار

ڈاکٹر رابعہ سرفراز نئی نسل کے ان نمائندہ اساتذہ میں سے ایک ہیں جو بیک وقت کئی جہتوں سے تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ شاعری، اقبال شناسی، ترجمہ، تنقید و تحقیق اوراب لسانیات کی یہ نئی تالیف قارئین کے سامنے ہے۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور دیگران تمام ممالک کے سنجیدہ قارئین (جہاں اُردو لکھی، پڑھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے) کے لیے رابعہ صاحبہ کی کتب اور مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ رابعہ صاحبہ کی تخلیق، تحقیق اور تنقید کی پختگی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد بلکہ بحیثیتِ مجموعی اُردو زبان و ادب کا معتبر نام ہیں جو روایت کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے بدلتے تقاضوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

ڈاکٹر رابعہ سرفراز کی علمی و ادبی دیانت، اخلاص اور ستائش کی تمنا کے بغیر زبان و ادب کے میدان میں آگے بڑھتے چلے جانے کی جستجو نے انھیں اپنے ہم عصر اہلِ قلم میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کا مثبت نقطۂ نظر ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی شناخت ان کے اساتذہ کی وہ علمی و ادبی کاوشیں ہوتی ہیں جو تخلیق، تحقیق اور تنقید کی صورت میں منظرِ عام پر آتی ہیں۔ اس اعتبار سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد حقیقی معنوں میں مبارک باد کی مستحق ہے جسے رابعہ صاحبہ جیسی سنجیدہ فکر استاد کی خدمات سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔

میں ڈاکٹر رابعہ سرفراز کو 'اُردو زبان اور بنیادی لسانیات' کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اوران کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
پروفیسر سنٹر آف انڈین لینگویجز
سکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچر سٹڈیز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

ISBN: 978-969-581-255-6
9789695812556

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284